انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

اڈیٹر

ظہیر الدّین مدنی

ترسیل زر

اکاؤنٹنٹ انجمن اسلام۔ ۹۲ ہارنبی روڈ بمبئی

خط و کتابت بنام

ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی

چندہ سالانہ	... ...	تین روپیہ
ششماہی	... ...	دو روپیہ
بیرونِ ہند	... ...	چار روپیہ
فی پرچہ		ایک روپیہ

پتہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ ۹۲ ہارنبی روڈ بمبئی ۱

انجمنِ اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

جلد ۱ | جنوری ۱۹۶۵ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ حال

یہ سچ ہے کہ تاریخ ماضی کو دُہراتی رہتی ہے، اردو زبان و ادب کو گجرات و دکن نے اپنے آغوشِ تربیت میں لیا اس کی خاطر خواہ پرورش و پرداخت کی اور جب اس نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا سیکھا تو شمالی ہند پہونچی وہاں اس کے ناز و غمزہ کی وجہ سے خوب آؤ بھگت ہوئی اور اس کا بھی وہاں ایسا دل لگا کہ وہیں کی ہو کر رہی، گجرات و دکن سے ہجرت تو نہیں کر گئی مگر گجرات کے لیے یہ ایک دور کی آواز بن کر رہ گئی، شمال میں اس کی فسوں سازی اور سحر طرازی نے وہ غضب ڈھایا کہ اس کے چاہنے والوں کے دو گروہ بن گئے جن میں سے ایک کا نام دہلی اور دوسرے کا نام لکھنؤ قرار پایا، ایک زمانہ وہ گزرا کہ جب دہلی و لکھنؤ اپنے اپنے حسن زبان کے قائم کردہ معیار پر فخر کرتے اور ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے مگر یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ سرسید اور ان کے رفقاء کار انیسویں صدی کی انقلابی سحر میں جاگے تو نئے ماحول سے بہت متاثر ہوئے اور ہر شعبۂ زندگی میں جس قدر آزادی سے اپنے آپ کو دور پاتے گئے اسی قدر تیزی سے اس کے پیچھے لپکے اور حیات و ممات کی ہر قید و بند سے نجات حاصل کرنا اپنا نصب العین بنا لیا پھر بھلا ایسے آزاد دنیائے ادب میں بندھن دیکھنا کیسے گوارا کرتے، پنجاب سے ایک صدا بلند ہوئی اور اس صدائے احتجاج میں وہ صداقت تھی کہ دہلی و لکھنؤ کے امتیازات کو

اگرچہ بالکل مٹا نہ دیا تو کم از کم اسے قصۂ پارینہ ضرور بنا دیا، مگر اس دن کی کسے خبر تھی کہ ایک روز انقلاب آنے والا ہے، انقلاب آیا اور اردو کی مرکزیت جو دہلی و لکھنؤ کے بعد ہندستان میں حیدر آباد کو کسی نہ کسی حیثیت سے حاصل ہوئی تھی چشم زدن میں ختم ہو گئی اور اب زمانہ کے تیور سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پھر دوبارہ خطۂ گجرات کو اردو زبان و ادب کی خدمت اور مرکزیت کا اعزاز حاصل ہونے والا ہے اور وہ دن دور نہیں جب دہلی و لکھنؤ کی گم شدہ متاع بے بہا کا سراغ بمبئی میں مل سکے گا۔

اردو کی خدمت کا جہاں تک تعلق ہے اگر صوبہ بمبئی کا سر اونچا نہیں تو کسی سے اس کا سر نیچا بھی نہیں، اگر تعلیمی حالت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں اردو کو کافی دخل ہے، ابتدائی مدارس میں اب تک ذریعۂ تعلیم برابر اردو قائم رکھا گیا ہے، تقریباً ہر بڑے شہر میں ثانوی تعلیم کا کم از کم ایک مدرسہ ایسا ضرور پایا جائے گا جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے یونیورسٹی کے ڈگری کے امتحانوں میں بھی اردو کا وہی درجہ قائم رکھا گیا ہے جو صوبہ کی دوسری زبانوں کو حاصل ہے، صوبہ کا کوئی شہر ایسا نہ ہوگا جہاں اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے کوئی ایک انجمن ذمہ دار نہ ہو، اخبارات و رسائل کی تعداد کو دیکھا جائے تو گمان غالب ہے کہ دوسرے ہر صوبہ پر بمبئی سبقت لے جائے گا جہاں تک بزم آرائی کا تعلق ہے صوبہ بمبئی کا ہی ایک شہر احمد آباد تھا۔ جہاں اپریل ۱۹۴۷ء میں اردو کی کانفرنس اس زمانے میں منعقد کی گئی جب کہ تعصب کی آگ ہر طرف شعلہ زن تھی اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ترقی پسند ادیبوں کی بھی ایک شاندار کانفرنس کے انعقاد کا بھی اعزاز اسی شہر کو حاصل ہے، خدا کا شکر ہے کہ آج بمبئی میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام نے صوبہ کے دعویٰ مرکزیت کی دلیل پیش کر دی اور اردو کی ترقی و اشاعت کے لیے ایک نیا ادارہ عالم وجود میں آیا،

وہ کیسی نیک ساعت ہوگی جب ۱۸۷۴ء میں انجمن اسلام بمبئی کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور صوبہ کی آبادی کی ایک کثیر تعداد کی تعلیم کا ذمہ اس کے کارپردازوں نے اپنے سر لیا، صوبہ بمبئی میں یہ انجمن سرسید

کی پکار کی صدائے بازگشت تھی، کیا یہ بات قابلِ داد نہیں کہ اس نے اپنی عمر کے ۷۵ سال کامیابی کے ساتھ ختم کر لیے اور اب اس کا عہدِ شباب آیا ہے، اس کی جوانی کا جوش اس کے نکھار سے عیاں ہے، گزشتہ ۷۵ سال میں کئی کارپرداز آئے ہوں گے، کئی بار اختلافِ رائے ہوا ہوگا لیکن اس کے نصب العین میں فرق نہ آیا اس کی فلاح و بہبود کا راز اس میں مضمر ہے کہ انجمن کے ابتدائی تیس سال کے بعد انجمن کو سیاست کے میدان سے نکال لیا گیا یا سیاست کو انجمن سے نکال دیا گیا اور صرف تعلیمی خدمات کے لیے اس کو وقف کر دیا گیا، اس کی ایک بڑی خوش قسمتی کی بات یہ بھی ہے کہ انجمن کے دورِ اول سے تا ایں وقت حکومت انجمن کی پشت پناہی کرتی رہی اور ہر طرح کی امداد دیتی رہی اور اس وقت تک امداد کر رہی ہے، بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں انجمن اسلام بمبئی کو جو حیثیت حاصل ہے وہ کسی شہر میں کسی ادارہ کو حاصل نہیں، انجمن کی کارگزاری بھی تو دیکھئے کہ آج انجمن کی سرپرستی و نگرانی میں دو ہائی اسکولز۔ دو گرلز اسکولز ایک کمرشل اسکول ایسے پانچ اسکول چل رہے ہیں، انجمن کی یہ کارگزاری سابق و موجودہ کارپردازوں کی صداقت، ہمدردی اور ایمانداری کا بہترین نمونہ ہے اور اس کی قدر و منزلت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ بمبئی کا ایک بہت بڑا اور قابلِ قدر ادارہ "صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ" اور ہاسٹل وغیرہ انجمن کی نگرانی میں دے دیا گیا، آج ڈاکٹر محمد بدل الرحمن۔ پرنسپل اسماعیل کالج۔ بمبئی یاد آتے ہیں کہ اس شخص نے ان اداروں کو ترقی دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اگر آج وہ زندہ ہوتے تو بمبئی میں اردو یونیورسٹی قائم ہو جاتی وہ اس کا داغ اپنے ساتھ لے گئے، اس قلعہ کا آخری برج یہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ہی جس کے قیام کے بعد یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا مگر افسوس کہ اس آخری برج کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہونچتے ہی موصوف نے رختِ سفر باندھا اور ہم کفِ افسوس ملتے رہ گئے۔

تھا کہ ہا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

فروری ۱۹۴۷ء میں انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے بعد ڈاکٹر صاحب مرحوم کی دعوت پر پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب نے لبیک کہا اور اس کی اعزازی ڈائرکٹرشپ قبول کر لی اور اس خدمت کو بخوبی انجام دیتے رہے، کامل دو سال کی ... جد و جہد کے بعد اب انسٹی ٹیوٹ اس قابل ہوا ہے کہ وہ اپنے لائحۂ عمل کے مطابق مختلف تجویزوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔ انسٹی ٹیوٹ کا سب سے بڑا اور اہم کام ریسرچ کا ہے، گجرات میں ابھی قدیم ادب کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جسے بر سرِ عام نہیں لایا گیا ہے، اردو کے ابتدائی دور میں صوفیائے کرام نے اردو زبان و ادب کی جو خدمت انجام دی ہے اور جو کارنامے یادگار چھوڑے ہیں ان پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف چراغِ راہ کا کام دے سکتا ہے لہٰذا اصل کارناموں کو شائع کرنے کی سخت ضرورت ہے، اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ایک نصاب نامہ مرتبہ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے عنقریب شائع ہونے والا ہے اور انشا اللہ ہر سال دو سے زائد کتابیں انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے شائع کی جائینگی۔

انسٹی ٹیوٹ کی دوسری اہم کارگذاری صوبہ بمبئی کے خاص و عام کتب خانوں کے بیش بہا ذخیروں کی فہرستیں بنانا ہے تاکہ تلاش تفتیش کے شائقین کتابوں کی کھوج میں صوبہ کا دورہ کرنے کی بجائے پہلے بیک نظر معلوم کر لیں کہ مطلوبہ کتب کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں اور ایسی کتابوں کا ریسرچ اسکالرز کے لیے مہیا کرنا بھی انسٹی ٹیوٹ کی بہت بڑی خدمت ہوگی، انسٹی ٹیوٹ کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ اسے بمبئی کی ایک قدیم اور قابل قدر لائبریری جس کا نام کریمی لائبریری ہے مل گئی ہے، اس لائبریری سے متعلق ادارہ کے رفیق کا ایک مختصر مضمون اس اشاعت میں شامل ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کی تیسری کارگزاری تقریروں کا سلسلہ ہے جو دو سال سے برابر جاری ہے ۱۹۴۸ء کے پہلے تین مہینوں میں سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب ممتاز حسین صاحب نے غالب پر بڑی پر از معلومات چار تقریریں کیں، ۱۹۴۸ء کے آخر میں جناب پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب

مولانا شبلی پر دو تقریریں کیں اور تنقید کا حق ادا کر دیا، ہماری فرمائش پر موصوف نے پہلی تقریر قلم بند کر دی ہے جو اس شمارہ میں شامل کر لی گئی ہے، نومبر ۱۹۴۹ء سے مولانا حالی پر تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اب تک مولانا محمد مہر خاں شہاب حالی پر نہایت عالمانہ دو تقریریں کر چکے ہیں، حالی پر ابھی دو سے تین تقریریں باقی ہیں۔

ادارہ میں قریب دو سال سے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تین طلباء پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی صاحب کی نگرانی میں مقالے تیار کر رہے ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ صرف اردو ہی کی ترقی و اشاعت میں کوشاں نہیں ہے بلکہ ہندستانی زبان و ادب جس کو مہاتما گاندھی ہندستان کی مشترکہ زبان و ادب بنانا چاہتے تھے اس کو بھی فروغ دینے میں ہندستانی پرچار سبھا کا ہاتھ بٹا رہا ہے، پرچار سبھا کے بڑے کارکن اور مہاتما گاندھی کے نظریوں کے بڑے حامی شری کا کا کالیکر صاحب نے ہندستانی لغات مرتب کرنے کا کام انسٹی ٹیوٹ کی نگرانی میں رکھا ہے یہ کام یہاں بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے، لغات کے ساتھ منتخب اردو ادب کو ناگری رسم خط میں منتقل کرنے کا کام بھی یہاں انجام دیا جا رہا ہے۔

انسٹی ٹیوٹ کی ایک اور قابل قدر کارگزاری رسالہ کا اجراء ہے، انسٹی ٹیوٹ میں جو کچھ کام ہوتا ہے اسے برسرِ عام لانے کے لیے رسالہ کی اشاعت بہت ضروری ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ نے حالات ناسازگار ہونے کے باوجود رسالہ کا اجراء کر دیا، اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ علمی دنیا سے انسٹی ٹیوٹ کا رشتہ اور زیادہ مستحکم ہو جائے گا زبان و ادب کے ماہر، ناقد اور محقق رسالہ نوائے ادب کے اجراء کا خیر مقدم کریں گے اور قلمی اعانت میں دریغ نہ کریں گے۔

نوائے ادب کا یہ پہلا شمارہ آپ کے سامنے پیش ہو رہا ہے، اس میں کئی خامیاں ہوں گی، لیکن آئندہ اُمید ہے کہ ہم تمام خامیوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں گے اور اس کے معیار کو بلند

لیا جائے گا۔

تمام قلمی معاونین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے ہماری پہلی کوشش میں ہاتھ بٹا کر ہمارے کام میں بڑی آسانی پیدا کردی۔ اور امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح ہماری حوصلہ افزائی فرماتے رہیں گے۔

دکن کی آخری طویل اردو مثنوی

(ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور)

اسحٰق سرزمین دکن کا ایک غیر معروف شاعر ہے، جو سنہ ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوا۔ اور بائیس سال کی عمر میں سنہ ۱۲۰۶ھ میں ایک طویل مثنوی ریاض العارفین لکھی جو اپنے مطالب اور طرز ادا کے لحاظ سے اردو کی عمدہ مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے، لیکن تعجب کی بات ہے کہ اردو دنیا اب تک اس کے نام اور اس مثنوی سے ناواقف رہی۔ حسنِ اتفاق سے اسحٰق کی اس شاہکار مثنوی کے دو نسخے ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں محفوظ ہو گئے ہیں۔

اس مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف دراصل بیجاپور کا رہنے والا تھا اور مثنوی لکھتے وقت مدرے میں مقیم تھا۔ (یہ مدرا غالباً ترچناپلی کے قریب کا مدرا ہے)

مصنف کے چار بھائی اور تھے۔ جو فہم و فراست میں کامل تھے۔ اس کا والد اس تصنیف کے وقت انتقال کر چکا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کا اس نے نام نہیں لکھا۔ البتہ اپنے ایک دوست یعقوب کا نام لکھا ہے جو دکنی شاعری میں استاد مانا جاتا تھا اسی دوست کے مشورے پر اسحٰق نے یہ مثنوی لکھی ہے جو کسی فارسی مثنوی کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مصنف نے مختلف مشاہیر شعرا و صوفیا مثلاً خواجہ فریدالدین عطار مولانا جامی۔ اور شیخ سعدی کی تحریروں سے استفادہ کر کے گیارہ ابواب منظوم کیے ہیں۔ جن کے عنوانات خود اس نے اس مثنوی کے سبب تالیف میں اس طرح درج کیے ہیں۔

باب اوّل خواہشِ قوتِ حلال	باب دویم بندگی ذوالجلال
باب سوم ترسِ حق رکھنا مدام	باب چارم ہے تحمل کا تمام

پانچواں ہے باب جو شام و سحر　　　حق اوپر رکھنا توکل کی نظر

بابِ ششم عاجزی لانا بجا　　　عیب پوشی خلق کی کرنا سدا

باب ہفتم زہد کا ہے پُرقدر　　　رنج ہور سختی سے کرنا صبر

بابِ ہشتم عشق سوں بھرپور ہے　　　ہمتِ عشاق سوں معمور ہے

بابِ نہم چھوڑ دنیائے دنی　　　یادِ حق سوں دل کو دینا روشنی

بابِ دہم پاک تو مانند جاں　　　اولیاؤں کی کرامت کا بیاں

گیارہواں ہے باب بر عزت نصاب　　　مقبلاں کی ہوئے سو دعوت مستجاب

اصل کتاب شروع کرنے سے قبل شاعر نے ان عنوانات پر طبع آزمائی کی ہے۔

۱۔ حمد	۱۰۶ ابیات	۲۔ مناجات	۱۰۲ ابیات
۳۔ نعت	۱۰۱ "	۴۔ مناجات بجناب سرورِ عالم	۲۴ "
۵۔ منقبت حضرت ابوبکر صدیقؓ	۱۸ "	۶۔ منقبت حضرت عمرؓ	۱۶ "
۷۔ منقبت حضرت عثمانؓ	۱۴ "	۸۔ منقبت حضرت علیؓ	۴۸ "
۹۔ منقبت محبوب سبحانیؓ	۱۷ "	۱۰۔ سبب تالیف کتاب	۸۴ "

خود مصنف نے اپنا نام کہیں نہیں لکھا۔ البتہ بعض جگہ اپنا تخلص اسحٰق استعمال کیا ہے۔ اور شاید یہ اس کے نام کا ایک جز تھا۔ جن ابیات میں یہ تخلص استعمال کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

کاں تو اے اسحٰق عاصی پرگناہ　　　کاں منزہ پاک درگاہِ الٰہ　　　ورق ۱۱

شکر کر منعم کا اے اسحٰق اب　　　جے تجھے بخشیا ہے نعمت پاک رب　　　" ۲۶

اے خداوندِ جہاں اسحٰق کوں　　　آشنائی دے اپس کی راہ سوں　　　" ۲۳۵

کبریا اسحٰق ہے غافل گناہ　　　کر اپس کی عرفیت کا آشنا　　　" ۲۴۴ ب

ہے پنیٹ غفلت میں اسحٰق اے الٰہ		کر قبولیت کی ٹک اس پر نگاہ		ورق ۲۴۸ ب

اے خدا اسحاق عاصی کوں مدام		رکھ اپس کی توں رضا میں صبح و شام		„ ۲۵۰

کر خدا اسحٰق کوں رحمت نصیب		رکھ اپس کے دوستاں کے نت قریب		„ ۲۵۱ ب

بخش دے اسحٰق کوں اے پاک رب		ہے ترے کن التجا یو روز و شب		„ ۲۵۴

اے دعایاں کے مجیب اسحٰق کوں		رہنمائی کر اپس کے لطف سوں		„ ۲۵۶ ب

عاجزِ اسحاق کوں اے کارساز		کر اپس کی قربیت سوں سرفراز		„ ۲۵۹

عاصی اسحٰق کو ہر دھات سوں		رکھ نگہبانی میں ہر آفات سوں		„ ۲۶۰

کردگارا عاجزِ اسحاق کوں		دور مت رکھ مقبلاں کے فضل سوں		„ ۲۶۲ ب

ختم کر اسحاق تو اس بات پر		کاں تلک لے جاوے گا یوں طول کر		„ ۲۶۷ ب

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ کتاب کے ابتدائی حصّے میں مصنّف نے صرف دو جگہ تخلص استعمال کیا ہے۔ اور آخر میں تقریباً ہر عنوان یا حکایت کے خاتمے پر اپنا تخلص استعمال کرتا رہا ہے۔

گیارہ ابواب کے تکمیل کے بعد مصنّف نے ایک اور عنوان قائم کیا ہے۔

”خاتمۂ ریاض العارفین بر شکوہ و سپاس خداوند جہاں آفریں“

اس عنوان کے تحت ۱۰۲ ابیات لکھی ہیں۔ ان ہی میں حسب ذیل آخری ابیات میں اپنی عمر، سنہ تصنیف اور آخر بار تخلص اس طرح لکھا ہے۔

جب کیا میں نظم یو شیریں مقال		عمر میری تب اتھی بادیس سال

ہور سن ہجرت شہ ذوالافتخار		تھی ہزار یک دو صد و شش در شمار

کر دھن کوں اپنے اے اسحٰق بند		طول مت کر مختصر ہے دل پسند

اس مثنوی میں جملہ ۵۹۰۰ ابیات ہیں۔ گویا یہ دکن کے آخری دورِ شاعری کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ اس کا آغاز ان ابیات سے ہوتا ہے۔

ابتدا کرتا ہوں بسم اللہ سوں — صاحبِ اجلال و عز و جاہ سوں
حمدِ حق ہے افسرِ فرقِ سخن — زینتِ ہر نامۂ نو و کہن
پر شرف انوار احمد ذوالجلال — ہے سخن کے چرخ کا روشن ہلال
کیا نثر کیا نظم ہر یک باب کوں — زیب و رونق ہے خدا کی حمد سوں
حمدِ حق سوں جو سخن ہے بے نواد — جوں طعامِ بے نمک ہے بے سواد

آخری ابیات یہ ہیں ـــــ

کب تلک یوں فکر سوں فرسودگی — بے فکر ہو لے ذرا آسودگی
دے خموشی اب زباں کوں بات سوں — رکھ قلم دان میں قلم کوں ہات سوں
بھیج اپنی بندگی کوں کر نمود — مصطفےٰؐ کی روحِ اشرف پر درود
ہور کرم آل ہور اصحاب پر — پڑھو تحیت ہور سخن کوں ختم کر

یہ مثنوی ۱۲۰۶ھ میں لکھی گئی ہے اور اس زمانے تک شمالی ہند میں میر، سودا میر حسن۔ جیسے شعرا نے اردو شاعری کے اسلوب و انداز کو بالکل ہی بدل دیا تھا لیکن اس بیجاپوری الاصل شاعر نے اپنے وطن کے زوال کے تقریباً سوا سو سال بعد بھی اسی زبان و اسلوب میں شعر لکھے ہیں جن کو اس کے ہم وطن شعرا نے اپنی رشحاتِ قلم سے عروجِ کمال پر پہونچایا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دکنی شعرا اتنی طویل مدت تک بھی اپنی زبان و کلچر کو سینے سے لگائے رہے۔

ریاض العارفین کے جو دو نسخے ادارے میں موجود ہیں ان میں سے پہلے کا نمبر ۱۴۲

ہے۔ یہ نسخہ قدیم دکنی کتابوں کی طرح پاکیزہ خط میں لکھا گیا ہے۔ عنوانات سرخی میں ہیں۔ اس کے آخر میں کاتب بڈن خان نے یہ ترقیمہ لکھا ہے۔

"ایں رسالۂ بابرکات ریاض العارفین بنا برحسب فرمائش
حضرت سید شاہ جلال الدین سرمست بتاریخ ہفتم ذی الحجہ
بروز جمعہ بوقت عصر اتمام یافت۔ کاتب الحروف عاصی بڈن خاں
احسن اللہ حالہ ومالہ

آخری ورق پر ٹیپو سلطان شہید کی شہادت کی حسب ذیل تاریخ بھی درج کی ہے۔

شمر لعیں بہ صورت عالم پدید شد — سر نظام مظہر عزم یزید شد
ٹیپو بوجہ دین محمد شہید شد — تاریخ گشتہ کشتن سلطان حیدری

چونکہ کاتب سن کتابت درج کرنا بھول گیا ہے اس لیے اس کتاب کا زمانہ کتابت اس قطعۂ تاریخ کے اندراج سے چل سکتا ہے جس کو بعنوان "تاریخ سلطان بہادر" درج کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب ٹیپو سلطان کا ہم عصر اور غالباً سلطنت میسور کا متوسل تھا۔ اس لیے اس نے نظام علی خاں کو یزید اور ان کے دیوان اور سپہ سالار افواج میر عالم کو شمر قرار دینے والے قطعہ کو "تاریخ سلطان بہادر" کے عنوان سے نقل کیا ہے۔ اس نسخے میں ۲۷۰ ورق ہیں اور ۱۱ ابیات فی صفحہ لکھی گئی ہیں۔ اس کی سائز "½۶ × "½۸ ہے۔

اس مثنوی کا دوسرا نسخہ ادارے کے قلمی کتب خانہ میں نمبر ۲۱۵ پر محفوظ ہے۔ یہ نسخہ بھی نسخہ ۲۱۴ کے قریبی زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ لیکن یہ نستعلیق خط میں ہے۔ جو بہت پاکیزہ اور خوش خط ہے۔ لیکن نسخہ ۲۱۴ سے مقابلہ کرنے پر پتہ چلا کہ اس میں ابتدائی ایک ورق کے بعد تقریباً ۵۰ ابیات غائب ہیں۔ جو غالباً ۲ اوراق پر مندرج ہوں گی۔ عجیب بات یہ ہے

کہ ریاض العارفین کے اس دوسرے نسخہ کا کاتب بھی سنہ لکھنا بھول گیا ہے اس کا ترقیمہ یہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریبًا ۲۰۰ صفحات کی یہ کتاب صرف ۶۵ دن میں لکھی گئی۔

بفضل الٰہی کتاب ریاض العارفین شروع غرہ شہر ربیع الثانی

ششم جمادی الثانی خاتمہ یافت۔ محررہ عبد فقیر حقیر کثیر التقصیر

بلا اشتباہ سید مسیح اللہ خلف الصدق سید فصیح اللہ خاں رحمت اللہ

علیہ"

اس نسخہ میں صرف ۱۹۶ ورق ہیں اور ۱۴ سطور فی صفحہ لکھی گئی ہیں۔ اس کا سائز ۵½" × ۸½" ہے۔

—

غالب کی اخلاقی شاعری

(جناب عبد القادر صاحب سروری)

غالب کی شاعری، اپنی نمایاں خاصیتوں کے لحاظ سے، غزل کی شاعری، یعنی غنائی شاعری ہے۔ غالب کی مخصوص طرزِ زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے، اخلاقی شاعری اور موعظت کا تعلق، ان کی شاعری سے، دور کا تعلق معلوم ہوتا ہے۔ عنفوانِ شباب میں ان کی زندگی، جیسی عیش کوشی میں گزری، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے، وعظ و پند اور رشد و ہدایت سے، اس طرزِ زندگی کو بہت کم تعلق دکھائی دیتا ہے غالباً اسی لیے ان کی شاعری کے اس پہلو پر نظر جمنے نہیں پاتی۔ اس کے باوجود، یہ واقعہ ہے کہ غالب کے کلام میں اخلاق اور موعظت کے اشعار، جس پایہ کے ملتے ہیں، اردو کے بہت کم شاعروں کے کلام میں دستیاب ہو سکیں گے۔ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو ادب میں بعض بہترین اخلاقی اشعار غالب ہی کے کلام میں پائے جاتے ہیں بہ ظاہر ایک تضاد سا معلوم ہوتا ہے لیکن فی نفسہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ بعض وقت دیکھا جاتا ہے کہ کچھ باتیں، ایسے شخص میں نہیں آتیں، جن سے عام طور پر اس کا تعلق سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ کبھی کبھی کسی فرد میں، کسی خاص خصوصیت کی کمی، اس کے ذہن میں، اس خصوصیت کی اہمیت بڑھا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جس کی ساری زندگی پاک بازی میں بسر ہوئی ہو، اس کی نظر میں پاکبازی شاید اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ اس کے لیے یہ ایک روزمرہ کی چیز ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف، ایک ایسا شخص، جس کی عمر کا بڑا حصہ، گناہگاری اور بے اعتدالیوں میں بسر ہوا ہو، وہ پارسائی اور خدا پرستی کو ایک خاص اہمیت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے، جو غالب کے پاس بھی دیکھی جاتی ہے۔ غالب کی ظاہری رند مشربی کی تہہ میں

خدا پرستی کا ایک گہرا احساس مضمر دکھائی دیتا ہے اور اس کا اثر کبھی کبھی ان کے اشعار میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔
ابتدائی زندگی کی پرلطف صحبتوں نے ان میں بعض عادتیں ایسی راسخ کر دی تھیں کہ آخر دم تک ترک نہ ہو سکیں
رند مشربی، غالب کو اس لیے پسند نہیں تھی کہ وہ اس کو اچھا جانتے تھے، یا اس کی اخلاقی اور دوسری برائیوں
سے ناواقف تھے۔ بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ وہ ایک نہایت رقیق قلب انسان تھے، اور بعض باتوں
کو برا جانتے ہوئے بھی، وہ ان کے ترک کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے نیچے کے شعروں سے، اس
بارے میں ان کے رویہ کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو　　　ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

ہے رے کسے ہے طاقت آشوب آگہی　　　کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

اسی طرح بہت سی چیزوں کو اچھا سمجھتے ہوئے بھی، وہ ان کے اختیار کرنے پر طبیعت
کو مائل نہیں پاتے تھے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ایک اور شعر میں اپنی سعی رسائی کی ناکامی پر اس طرح شرمندگی کا اظہار کرتے ہیں۔

ہے نذر کرم تحفہ ہے شرم نارسائی کا　　　بہ خوں غلطیدہ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

یہ بھی صحیح ہے کہ بعض وقت، اخلاقی مضامین غالب کے کلام میں "برائے شعر گفتن" کی اہمیت
رکھتے ہیں، تاہم ان اشعار میں بھی دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عام شاعروں کے رسمی اخلاقی مضامین، جو
زیادہ تر "عاشقانہ اخلاق" اور وضع داری تک محدود تھے، غالب کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ بعض جگہ
غالب کے اشعار کا اخلاقی کردار اتنا غیر رسمی اور غیر مشکوک ہے کہ، اس سے ان کے ذاتی جذبات
کے سوا اور کسی تحریک کا پتہ نہیں چل سکتا۔ یہی دراصل وہ مقامات ہیں، جن میں ہم اصلی غالب اور اس کی

کی سچی اخلاقی حس کو پا سکتے ہیں۔ جس طرح بعض اور پہلوؤں سے، غالب کی غنائی شاعری، دوسرے عام غزل گو شاعروں کی طرح، غیر شخصی نہیں اسی طرح ان کی شاعری کا اخلاقی پہلو بھی عموماً ان کے اخلاقی معیاروں اور احساسات کو ظاہر کرتا ہے۔ یہاں بھی کبھی کبھی ان کی دل کی سچی دھڑکنیں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ جو آپ کے دل کو بھی شاعر کے دل سے اتنا قریب کر دیتی ہیں کہ وہ شاعر کے دل کی حرکت کے ساتھ زیر و زبر ہونے لگتا ہے۔

غالب کی بظاہر لاابالی طرز زندگی کے گوشت پوست کے اندر، چند اخلاقی اصولوں کا ایک مضبوط ڈھانچا موجود دکھائی دیتا ہے جو سعدی اور حالی کی شاعری کی طرح نمایاں تو نہیں، پھر بھی توجہ طلب ضرور ہے۔

غالب کی شاعری کے اس خاص پہلو کا مطالعہ کرتے ہوئے، یہ بات ہمارے ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ ہم جب غالب کی شاعری کا مطالعہ اخلاقی نقطہ نظر سے کرتے ہیں، تو یہاں ہم کو ایسے اشعار نسبتاً کم ملتے ہیں، جو اخلاق یا اخلاقی تربیت پر براہ راست موثر کہے جا سکتے ہوں، گو ایسے اشعار سے بھی ان کا دیوان بالکلیہ خالی نہیں، جن میں کوئی اخلاقی مقصد یا اصول واضح طور پر، پیش نظر رکھا گیا ہے۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی ایسے اشعار کی تعداد، ان اشعار کے مقابلے میں کم ہے، جو وسیع معنوں میں ہماری اخلاقی حس کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس وسعت پذیر مفہوم کے لحاظ سے، اگر غالب کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو شاید ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے اردو دیوان کا کم سے کم آٹھواں یا دسواں حصہ ایسے اشعار پر مشتمل دکھائی دے گا، جو کوئی نہ کوئی اخلاقی پس منظر رکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ غالب کا شعری معیار اپنے ہم عصر شاعروں کے مقابلے میں اتنا بلند تھا کہ، عام پسند باتیں کہنے سے ان کے ذوق شعری کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے اشعار کے اخلاقی پہلو کی طرف کبھی کبھی ذہن کے فوراً منتقل نہ ہو سکنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ غالب کا شعری آرٹ اتنا سادہ نہیں۔ وہ بہت سی باتیں استعارے اور کنائے کے پیرایہ میں بیان کر جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے زمانے کے شعری تصورات پر، تغزل کا رنگ غالب

تھا، اور غالب بھی اکثر اسی اصطلاحیت سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے عام دلچسپی کی خاطر ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والے اشعار کے ظاہر مفہوم سے مسرور ہو کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

غالب کے ایسے اشعار، جن میں راست کوئی اخلاقی نکتہ پیش کیا گیا ہے، ان سے، سب سے زیادہ نمایاں اخلاقی اصول جو مترشح ہوتا ہے، وہ احسان مندی کی زبونی ہے۔ اس معاملے میں غالب کا نقطۂ نظر، قدیم اسلامی علماء سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے، جن کے قانون اخلاق میں، دوسرے کا احسان اٹھانا، گناہ کے برابر تھا۔ سعدی نے اخلاقی جواں مردی کے ایسے نمونے اپنے اشعار میں پیش کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

ہر کہ ناں از عمل خویش خورد منت حاتم طائی نہ برد

حتی کہ جنت میں بھی، دوسرے کی مدد سے جانے کو وہ دوزخ سے کم نہیں سمجھتے۔ چنانچہ کہتے ہیں:-

حقا! عقوبت دوزخ برابر ست رفتن بپائے مردئ ہمسایہ در بہشت

غالب بھی دوسروں کی مدد پر تکیہ لگائے بیٹھنے کو بہت برا بتاتے ہیں، کیونکہ اس سے آدمی کی خودداری کو ٹھیس لگتی ہے چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں:-

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب! نہ احساں اٹھائیے

احسان مندی کا ایک زبوں نتیجہ انفعال بھی ہے، اور ہمت مردانہ کبھی دوسروں کا احسان اٹھا کر، اپنے آپ کو انفعالیت کی کشمکش میں مبتلا کرنا گوارا نہیں کر سکتی کہتے ہیں:-

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہ ہو

غالب کے اخلاقی مضامین میں خودداری کی تلقین ایک دوسرا اہم موضوع ہے، لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے انسان کا خاص انداز اکثر جگہ ترغیبی سے زیادہ خود احتسابی ہوتا ہے۔ یعنی وہ یہ

کہنے کی بجائے کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو، کسی اخلاقی مسئلہ کو اپنی ذات سے وابستہ کرکے، ایک بیان، ایک واقعہ بنا دیتے ہیں۔ اس سے شعر کی اخلاقی اہمیت گھٹتی نہیں، بلکہ اس کے اثر میں کئی گونا اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شعر میں وہ اپنی خودداری کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ہم کہنے کو تو بندے بن کر پیدا ہوئے ہیں اور بندگی میں خودداری اور خودبینی کی گنجائش نہیں، اس کے باوجود، بندگی کی سرمنزل میں بھی خودداری کا احساس فنا ہونے نہیں پایا۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس شعر میں انداز اظہار کے لحاظ سے مبالغہ سہی، لیکن اس طرزِ فکر کو غالب کی خودداری کے ساتھ جو فطری مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ اس شعر کا مطلب کوئی پڑھنے والا، وہ نہیں لیتا جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ وہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ خودداری کی اہمیت کو جتانے کا ایک پیرایہ ہے جو استعارے میں ادا کیا گیا ہے۔ ایک اور شعر میں، غالب اسی احساس خودداری کا اظہار اس پیرائے میں کرتے ہیں کہ انسان کی قدر و قیمت کے مقابلے میں دونوں جہاں بھی ہیچ ہیں۔ فرماتے ہیں۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے:۔

لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے
سینہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم

عشق و محبت کے تعلقات میں بھی، جہاں دوسرے عاشق، کسی طرح کی بے عزتی کو بے عزتی نہیں سمجھتے، غالب کی خودداری کی خو نہیں چھوٹتی۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

جد و جہد اور کمال رسی کی ترغیب بھی، غالب کی شاعری کے اخلاقی مضامین میں سے ایک

اہم مضمون ہے۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً یہ بات کہ افراد اور اس سے بڑھ کر قومیں، جب جد و جہد سے جی چرانے لگتی ہیں، تو اپنی راحت طلبی کی تائید کے لیے نئے نئے بہانے ڈھونڈھ لیتی یا نئے نئے نظریے تراش لیتی ہیں۔ غالب نے غنائی شاعری کی حدود میں رہ کر، اس نفسی کیفیت کو یوں ظاہر کیا ہے:۔

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار، اے دل کیا ہے کس نے اشارہ کہ ناز بستر کھینچ

اسی طرح کا ایک شعر اور بھی ہے، جس میں وہ بتاتے ہیں کہ "بے خودی" بے فکری کی تمہید کس طرح بن سکتی ہے۔

بے خودی بستر تمہید فراغت ہو جو پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

خواہش دراصل عمل کی محرک ہوتی ہے، جس دل میں آرزو نہ ہو، اس دل میں جد و جہد کی حس کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے غالب فرماتے ہیں کہ، دل آرزو سے کبھی خالی نہ رہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے لیے "مے کشی" ممکن نہ ہو سکے، تو "انتظار کشی" ہی کافی ہے۔ شعر ہے:۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ اگر شراب نہیں، انتظار ساغر کھینچ

ایک اور شعر میں وہ عمل کی تحریص، اپنی ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں دلاتے ہیں:۔

اپنا تو نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ایک اور جگہ ڈوبتے ہوئے دلوں کو وہ یہ کہہ کر ابھارتے ہیں، کہ کسی اور کی ناکامی سے تم کو کیا مطلب، اپنی سعی تم آپ کیے جاؤ۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نا، ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

انسان جب جد و جہد پر آمادہ ہو جائے، تو پھر صحیح رہبری کے لیے اس کو اپنی جد و جہد کا کوئی مقصد بھی معین کر لینا چاہیے۔ بغیر مقصد کے، اس کی جد و جہد، ناخدا کے بغیر چلتی ہوئی

نائی ہوگی۔ مقصد کے تعین اور جدوجہد کے لیے آمادہ ہوتے ہی یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ عظمت کا راستہ اتنا آسان نہیں، بلکہ

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

یہ بات بھی نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ انسان کا مقصد جس قدر اعلیٰ اور اس کے حوصلے جس قدر بلند ہوں گے، اس کی جدوجہد کی تیزی اور تندی بھی، اسی مناسبت سے ہوگی۔ چنانچہ

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا تھا

ہنر اور کمال کے بارے میں بھی غالب نے ایک دو شعروں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہنر اور کمال کی ان کی نظر میں کوئی ذات پات نہیں، بلکہ وہ ہر ہنر کو وہ اس کے کمال کے معیار سے جانچنے کی طرف مائل دکھائی دیتے ہیں۔ ذیل کے شعر، اس میں شک نہیں کہ عشقیہ اور غزل کی شاعری کے سیاق و سباق میں لکھے گئے ہیں، ان کے خیالات کو مبہم نہیں بنا سکتے۔ فرماتے ہیں:۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

پیشے میں عیب نہیں رکھیئے نہ فرہاد کو نام ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

نیز یہ شعر

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

کمال رسی کے بعد، اہل کمال میں احساس برتری کے ابھرنے کے جو امکانات ہیں، اور ان کے بنظر، وہ ہر کس و ناکس سے جو احترام اور قدردانی کی توقع کرنے لگتا ہے، اس کے جوش پر غالب اپنے مخصوص اور شخصی واردات کو بیان کرنے کے انداز میں اس طرح ٹھنڈا پانی انڈیلتے ہیں:۔

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا سمجھا ہوں دل پذیر متاع ہنر کو میں

غالب کی شاعری کے ایک خاص پہلو، یعنی حیات کے زود فنا ہونے اور مصائب اور آلام سے پُر ہونے کے بارے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اور اتنے مختلف نقاط نظر سے، اس پر

بحثیں ہو چکی ہیں کہ ارباب فکر و نظر کے لیے اچھا خاصہ مواد فراہم ہو گیا ہے۔ اس موضوع پر غالب کے بعض شعر و رند کے بہترین اور خیال نزا اشعار میں سے سمجھے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہمارے اپنے دور کے نقاد، حیات کے بارے میں غالب کے نقطہ نظر کو یک رخی سمجھیں اور شاید یہ بھی درست ہے کہ موجودہ نسل کے لیے اس طرح کے خیالات کے پرچار کو بہت زیادہ موزوں بھی نہ سمجھا جائے، لیکن غالب کے زمانے تک اکثر صاحبان فکر اسی طرح کے خیالات کی تبلیغ کرتے چلے آئے تھے۔ اس کی نفسیاتی توجیہہ غالباً یہ تھی کہ انسان جو فطرتاً آرام پسند واقع ہوا ہے، دنیا کے عیش و نشاط میں پھنس کر، مقصد حیات سے غافل نہ ہو جائے۔ اسی لیے وہ بار بار دنیا اور اس کے جاہ و ثروت کی زوال پذیری کی طرف توجہ منعطف کرانا ضروری سمجھتے تھے۔ پھر یہ بھی صحیح ہے کہ انسان کی بہت سی نیک خصلتیں، اسی عقیدے کے تحت نشو و نما پاتی ہیں۔ اگر کوئی شاعر محض اس غرض سے زندگی کے اس پہلو کی جانب ہماری توجہ کبھی کبھی منعطف کراتا رہے، تو اس میں بنی نوع انسان کا فائدہ ہی متصور ہے۔ نقصان کا کوئی شائبہ نہیں۔

(باقی)

حیات شبلی پر ایک نظر

(پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار)

علامہ سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کے معنوی فرزند اور حقیقی جانشین ہیں، شبلی کی طرح ان کی علمی فتوحات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، شبلی ایک مورخ، ادیب، ناقد اور محقق تھے۔ سید صاحب بھی ان تمام میدانوں کے شہسوار ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ایک محقق کی حیثیت سے بعض باتوں میں سید صاحب اپنے استاد سے بھی بڑھ کر ہیں، اس تقدم کا سب سے بڑا سبب شبلی ایسی محسن استاد کی دستگیری ہے جو سید صاحب کو عنفوان شباب میں ہی میسر آگئی اور جس نے ان کے جوہر کو پوری طرح چمکایا، اس کے علاوہ علمی کام کے لیے جو سہولتیں سید صاحب کو نصیب ہوئیں وہ ان کے استاد کو میسر نہ تھیں، مشرق اور مغرب میں جس سرعت کے ساتھ اسلامی علوم و فنون کے ذخیرے علماء کے استفادہ کے لیے پچھلے تیس سال میں منصۂ ظہور پر لائے گئے وہ بھی ایک حد تک سید صاحب کی علمی تحقیقات کے دائرے کی وسعت کے ضامن ہیں، بادی النظر میں جو فرق استاد اور شاگرد کے درمیان نظر آتا ہے وہ ذوق و میلان کا فرق ہے، شبلی ایک حساس دل رکھتے تھے اور ان کے احساسات کے اظہار کا بہترین ذریعہ ان کی شاعری تھی، جہاں تک فارسی زبان کی چاشنی کا تعلق ہے شاید ہی عصر حاضر کے ہندوستان کا کوئی دوسرا شاعر شبلی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے اور یہ طفیل ہے ان کے شائستہ مذاق اور فارسی شعرا کے کلام کے گہرے مطالعہ کا، اسی طرح ان کی سیاسی نظمیں جو انھوں نے اردو میں لکھیں اگرچہ ان کی حیثیت مقامی اور محدود ہے تاہم وہ ایک قادر الکلام فن کار کے کمال کی شاہد ہیں، سید صاحب نے بھی اردو، فارسی اور عربی میں طبع آزمائی

کی ہے لیکن ان کی نظموں میں کوئی خاص بات نہیں، ایک دوسرا نمایاں فرق جو انھیں استاد سے ممیز کرتا ہے وہ سید صاحب کا روحانیت اور تقدس کی طرف بڑھتا ہوا میلان ہے، بعض حلقوں میں روحانیت پر جو حد سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے شبلی کو وہ قطعاً پسند نہ تھا، وہ اپنے دور کے ایک ممتاز متکلم تھے اور سید صاحب کی رائے میں ان کی اکثر تصنیفات علم کلام کی کتابیں ہیں بلکہ سیرت النبیؐ کی تالیف شبلی کے نزدیک علم کلام کی سب سے بڑی ضرورت تھی،(۱) اگر غور سے دیکھا جائے تو سید صاحب کا بڑا کارنامہ یعنی سیرۃ النبیؐ کی تکمیل ایک متکلمانہ فرض کی ادائگی ہے، اسی طرح ارض القرآن، حیات مالک، سیرت عائشہ صدیقہ اور بے شمار مقالوں کا شمار بھی اسی دائرہ میں ہے تاہم سید صاحب اپنے روحانی احساس کی تسکین کے لیے تھانہ بھون کی طرف دست عقیدت بڑھاتے ہیں اور "جامع المجددین" کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو کر اپنے بعض خیالات سے رجوع کر لیتے ہیں مثلاً سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد میں سید صاحب نے بڑے مدلل طریق پر معراج کو روحانی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نئی زندگی کے بعد وہ اپنی پرانی رائے ترک کر کے جمہور کے ہم نوا بن گئے،(۲) اسی روحانیت کے زیر اثر سید صاحب متکلمین کی خامیاں ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "علم کلام صرف معترضوں کی زبان کو بند کرنا سکھاتا ہے لیکن بند دلوں کو کھولنا اس کا کام نہیں" تاہم سید صاحب کے نزدیک علم کلام کو بیکار اور ہیچ سمجھنا غلطی ہے اور متکلمین کی مثال اسلامی سلطنت کے مجاہد سپاہیوں کی ہے جو دین کو معترضوں کے خطرے اور دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے علم و فن کی بساط بھر کوشش کرتے ہیں، سید صاحب کے رجوع کی ایک اور مثال جانداروں کی تصویر کی ہے، غالباً ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں تصویر کھنچوانے کے جواز میں انھوں نے رسالۂ معارف میں دو مضمون لکھے تھے لیکن اب آپ کے نزدیک کسی جاندار کی تصویر کی اشاعت جائز نہیں چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حیات شبلی میں شبلی کی تصویر کو جگہ نہیں دی گئی، اس

---

(۱) دیباچہ صفحہ ۵۱،

سلسلہ میں شاید اس لطیفہ کا ذکر کرنا دلچسپی کا باعث ہوگا جسے سید صاحب نے دوسرے مقالے کے آخر میں درج کیا تھا، امرت سر کے مرحوم رئیس بابو نظام الدین تاجر چرم مسلمانوں کے تعلیمی کاموں اور بالخصوص ندوۃ العلماء کی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا کرتے تھے، اس تصویر کے متعلق جو ان کے مکان میں آویزاں تھی کسی شخص کے استفسار کے جواب میں بابو صاحب نے کہا کہ یہ تصویر نہیں ہے بلکہ تصویر کے جواز کا فتویٰ ہے اس لیے کہ جو بزرگ اس تصویر کی رونق کا باعث تھے ان میں سید رشید رضا مصری، مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

شبلی کے ارشد تلامذہ ہونے کی حیثیت سے اپنے استاد کے سوانح حیات لکھنے کیلئے سید صاحب سب سے زیادہ مستحق ہیں اور استاد کی بھی یہی خواہش تھی، انھیں افتخار عالم مارہروی کے[1] "آلودہ ہاتھوں" سے حیات شبلی کا لکھا جانا قطعاً گوارا نہ تھا، سید صاحب ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ شبلی کا یہ انکار براہ ترفع و اشک بار نہ تھا لیکن اس تاویل کو قبول کرنا ذرا مشکل کام ہے، اس لیے کہ جب سید صاحب نے پونہ سے مارہروی صاحب کی سفارش کی تو مولانا شبلی نے جواب میں لکھا، "افتخار عالم صاحب میری لائف کیا لکھیں گے، کبھی تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی لکھنا" خدا کی قدرت دیکھئے[2] کہ شبلی کی پیشنگوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی اور سید صاحب نے حیات شبلی اس وقت لکھی جب کہ وہ دوسرے کاموں سے فارغ ہو چکے تھے۔

جب شبلی سنہ ۱۹۱۳ء میں اپنی امیدوں کے مرکز ندوہ سے الگ ہونے پر مجبور ہو گئے[3] تو ان کے سامنے صرف ایک میدان تھا اور وہ میدان تصنیفی انجمن کا تھا چنانچہ وہ اپنے ایک دوست کو جو آج ان کے مخالفین کے زمرے میں شریک ہیں لکھتے ہیں: "ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں

عہ۱ دیباچہ صفحہ ۴۴　عہ۲ ایضاً صفحہ ۵۴　عہ۳ حیات شبلی صفحہ ۶۹۱

آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے"۔ شبلی کا یہ قول کس قدر سچا ہے، خود شبلی اور ان کے بعد ان کے قابل ترین شاگرد سید سلیمان صاحب ندوی علمی حلقوں میں جس عزت و احترام کے مستحق سمجھے جاتے ہیں وہ سب پر عیاں ہے، سنہ ۱۹۲۰ء میں جب کہ سید صاحب بمشکل پینتیس برس کے ہوں گے علماء کے زمرہ میں سے وفد خلافت کی رکنیت کیلئے انھیں منتخب کیا گیا، اس امتیاز کا بڑا سبب یہ تھا کہ بہت چھوٹی عمر میں سید صاحب علمی حلقوں میں اپنی فضیلت علم کا لوہا منوا چکے تھے، یہی وہ موقع ہے جب اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

سلیمان کی بات کیسی بنی — وہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی
رہے بادہ نوشوں سے بیشک بچے — مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی
محمد علی کی رفاقت میں ہیں — خدا خیر سے ان کو کر دے غنی

ابھی سید صاحب کی تعلیم ہی کا زمانہ تھا کہ شبلی نے نوجوان شاگرد کی صلاحیتوں کا اندازہ کر لیا تھا چنانچہ نومبر سنہ ۱۹۰۴ء میں سید صاحب شبلی کی رائے میں ایک جوہر قابل تھے (حیات شبلی صفحہ ۰۰۳) ندوۃ العلماء کے مختلف اجلاسوں میں سید صاحب نے جس انداز میں بغیر کسی تیاری کے عربی زبان میں تقریریں کیں ان کی بدولت وہ علمی حلقوں میں کافی روشناس ہو گئے، اس کے علاوہ رہبر کامل کی دستگیری نے انھیں کہیں سے کہیں پہونچا دیا، وہ کئی بار رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، دار العلوم ندوہ میں انھیں جدید عربی کا معلم مقرر کیا گیا، عربی زبان میں نئے الفاظ کا لغت مرتب کرنے کیلئے انھیں چنا گیا، چنانچہ انھوں نے لغات جدیدہ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی، شبلی کی زندگی کا آخری کارنامہ سیرۃ النبیؐ ہے جس کی ناتمامی کی حسرت وہ اپنے ساتھ قبر میں لے گئے، اس کی تالیف کے دوران میں بطور عربی مددگار کے سید صاحب کا انتخاب عمل میں آیا، شبلی کا دم واپسیں تھا جب انھوں نے سید صاحب سے سیرت کی تکمیل کے لیے کہا چنانچہ سید صاحب سالہا سال سے اس کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

اس مختصر سے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ استاد کی زندگی میں ہی سید صاحب اپنے لیے ایک امتیازی حیثیت حاصل کر چکے تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے علمی کمالات کا زمانہ اپنے استاد کی وفات کے بعد سے شروع ہوتا ہے، ان کا سب سے پہلا بڑا علمی کارنامہ ارض القرآن ہے جس کی پہلی جلد ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے سید صاحب پر تحسین و آفرین کی بارش ہونے لگی، مرحوم شرر نے تو جوش تعریف میں یہاں تک لکھ دیا کہ علمی تحقیق میں سید صاحب اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے ہیں، یہ پہلا موقع تھا کہ میرے کان سید صاحب کے نام سے آشنا ہوئے، جب کہ امرت سر کے اخبار وکیل میں ارض القرآن پر ایک تبصرہ شائع ہوا تھا، اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں بعض عربی کتبوں کے سمجھنے کیلئے سید صاحب نے عبرانی زبان میں بھی کچھ درک حاصل کیا، ارض القرآن کی دو جلدوں کی اشاعت کے بعد سید صاحب کی علمی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری ہے، ان متعدد مقالوں کے علاوہ جو سید صاحب نے دار المصنفین کے رسالہ معارف میں لکھے ہیں وہ مستقل کتابوں کی تصنیف میں مصروف رہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے استاد مرحوم کی وصیت کی تعمیل بھی کرتے رہے چنانچہ سیرۃ النبیؐ کی پہلی دو جلدوں کو چھوڑ کر جو بہت حد تک شبلی کی لکھی ہوئی ہیں باقی چار جلدیں سید صاحب کی ذاتی کوشش اور محنت کا نتیجہ ہیں، اگر سچ پوچھئے تو اب اس کی حیثیت ایک اچھی خاصی انسائیکلوپیڈیا کی سی ہے، میں پہلے عرض کر گیا ہوں کہ شبلی کو سیرت کی تکمیل کی حسرت رہ گئی، ان کی زبردست خواہش تھی کہ عجم کی مدح اور عباسیوں کی داستان سرائی کے بعد وہ دربار رسالت کا ایک ایسا مرقع دنیا کے سامنے پیش کریں جس کی مثال صدیوں تک نہ مل سکے لیکن سخت افسوس ہے کہ موت کے آہنی پنجے نے انھیں اس کی مہلت نہ دی، نہ معلوم شبلی کی روح اس کارنامہ سے مطمئن ہے یا نہیں لیکن یہ امر واقع ہے کہ بعض اہل علم کے نزدیک دوسری جلد کے بعد سیرۃ النبیؐ سیرت کی کتاب نہیں رہی بلکہ علم الکلام کی ایک کتاب بن کر رہ گئی ہے، تیسرے حصے کو ملاحظہ کیجئے، یہ پورے کا پورا معجزہ کے امکان اور چھوٹے

بڑے معجزات کی نذر کر دیا گیا ہے، یقیناً شبلی کی کاوش کا مصرف کچھ اور ہوتا خاص طور پر جب کہ وہ کلام جدید میں معجزات پر بحث بھی کر چکے تھے، مسئلہ کے اس پہلو سے الگ ہو کر دیکھیں تو تیسری جلد میں معجزات کی بحث بڑی دل چسپ ہے، ع

در کفی جام شریعت در کفی سندان عشق!

ایک طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی تسکین اور تشفی پیش نظر ہے تو دوسری طرف علمائے کرام کے چیں بہ جبیں ہونے کا خوف دامن گیر ہے، اس کش مکش کا نتیجہ ظاہر ہے، فلسفۂ جدیدہ کے سلسلے میں فلسفی مولوی عبد الباری ندوی سے مدد لی گئی ہے لیکن ان دونوں سے زیادہ دل چسپ باب وہ ہے جس میں سید صاحب نے قرآن اور معجزہ کے مسئلہ پر بڑی دل کش اور اطمینان بخش بحث کی ہے، اب اس کے بعد بڑے بڑے معجزات کی باری آتی ہے مثلاً شق القمر اور معراج، سید صاحب نے مدلل طریقے پر معراج کا روحانی ہونا بیان کیا ہے لیکن تھانہ بھون کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنی رائے سے رجوع کر چکے ہیں، چوتھی جلد میں منصب نبوت اور عقائد سے بحث کی گئی ہے، پانچویں جلد میں رسولِ مقبول کی عبادات و معاملات کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور چھٹی جلد میں ہمارے آقائے نامدار کے اخلاق کی پر لطف تصویر سے آراستہ ہے۔

سیرۃ النبی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ سید صاحب نے ہمارے علمی سرمایہ میں اور گرانقدر اضافے بھی کیے، امام مالک اور حضرت عائشہ صدیقہ کے سوانح حیات مرتب کیے، بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن نے عربوں کی جہاز رانی پران کے فاضلانہ مقالے کتابی صورت میں شائع کیے، صوبجات متحدہ کی ہندستانی اکیڈیمی کی سرپرستی میں عرب و ہند کے تعلقات پر سید صاحب نے اپنی محققانہ تالیف شائع کی، یہ کتاب موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے بہت مفید معلومات کی حامل ہے، سید صاحب پہلے محقق ہیں جنھوں نے اردو زبان میں اس موضوع کے مختلف گوشوں پر بیش قیمت

معلومات کو بڑی تحقیق اور قابلیت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کتاب میں بعض حد درجہ ضعیف اور کمزور چیزیں بھی آگئی ہیں مثلاً حضرت شہربانو کا ہندستانی ہونا یا کوروں اور پانڈوں کا آپس میں عربی زبان میں بات چیت کرنا، ان تصانیف سے قطع نظر خیام پر سید صاحب کی تالیف ایک ایسا شاندار کارنامہ ہے جس پر اردو زبان بجا طور پر فخر کر سکتی ہے، اس میں سید صاحب نے مستشرقین کی تحقیقات کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و کاوش کے نتیجے اہل نظر کے سامنے پیش کیے ہیں اور خیام کا مرتبہ ایک فلسفی اور ریاضی کی حیثیت سے متعین کرنے کی کوشش کی ہے، اس کتاب میں سید صاحب نے قوت تخیل سے بہت کم کام لیتے ہوئے تحقیق کے دوران میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے، خود سید صاحب کو اس کتاب پر ناز ہے، میری ناقص رائے میں سید صاحب کی یہ بہترین تصنیف ہے، بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق و مغرب کی کسی زبان میں خیام پر اتنی جامع اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی، شاید بعض لوگ یہ کہہ اٹھیں کہ مرحوم پروفیسر شیرانی نے رباعی کے سلسلہ میں سید صاحب کے بعض نتائج فکر سے اختلاف کیا ہے، یہ اعتراض بالکل بجا ہے، رباعی کے بارے میں سید صاحب کے اکثر و بیشتر بیانات محل نظر ہیں تاہم اس خامی کے باوجود خیام اردو ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہے۔

سید صاحب کے علمی کمالات اس بات کے بہترین ضامن ہیں کہ شبلی جیسے نادرۂ روزگار کی سوانح عمری لکھنے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے وہ ان تمام وادیوں کی سیر کر چکے ہیں جن کی شبلی نے برسوں سیاحی کی، اسلامی تاریخ و علم کلام میں ان کے علمی تجرے سے کون انکار کر سکتا ہے، شبلی کی زندگی میں ہی افتخار عالم مارہروی نے چاہا کہ ان کے سوانح حیات مرتب کریں، لیکن شبلی اس پر راضی نہ ہوئے، ان کی وفات کے بعد خود ان کے شاگردوں میں سے مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے کوشش کی لیکن ان کے مرتب کردہ مجموعہ میں زندگی کی روح نہ تھی اس لیے شبلی کے ایک اور عقیدت مند

شاگرد اقبال احمد صاحب سہیل نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کی کوشش کی لیکن یہ بھی کوشش ناتمام رہی، آخر سید صاحب آگے بڑھے اور چند سال روز و شب کی محنت کے بعد وہ حسن و خوبی کا ایک صحیفہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

حیات شبلی کے ماخذ علمی تبحر کے علاوہ سید صاحب کو اپنے دس گیارہ سال کے تعلقات کی بناء پر بھی شبلی کے سوانح نگار بننے کا استحقاق حاصل ہے، اپنے استاد کے محاسن اور معائب دیکھنے کا انھیں پورا موقع ملا ہے اس لیے قدرتی طور پر ان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ شبلی کی ایک صحیح، سچی اور مکمل تصویر پیش کریں گے، ان کا دعویٰ ہے کہ لفظ و معنی کی رنگ آمیزی سے انھوں نے سچی اور اصلی تصویر تیار کی ہے، سید صاحب نے تحقیق و جستجو میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا، ذاتی معلومات، شبلی کے اعزہ و اقرباء سے استفسار اور ان کے بعض دوستوں اور شاگردوں کے بیانات سے کافی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ علی گڈھ گزٹ اور الندوہ کے پرانے پرچے اور ندوۃ العلماء اور ایجوکیشنل کانفرنس کی روداد یں بھی اس سلسلہ میں مفید ثابت ہوئی ہیں، شبلی کے اردو اور فارسی کلام کے مجموعوں سے بھی بعض مواقع پر استفادہ کیا گیا ہے، سب سے بڑا ماخذ مکاتیب شبلی کی دو جلدیں ہیں جنھیں خود سید صاحب نے مرتب کیا ہے، یہ خطوط شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کافی روشنی ڈالتے ہیں اور چونکہ سید صاحب کا بڑا ذریعہ معلومات یہی خطوط ہیں اس لیے سید صاحب کا ارشاد ہے کہ ایک لحاظ سے حیات شبلی مولانا شبلی کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔

حیات شبلی کے یہی ماخذ ہیں جن سے سید صاحب نے مواد حاصل کر کے ایک بلند عمارت تیار کر دی ہے، اعتماد اور قدر و قیمت کے اعتبار سے ان ماخذوں کا درجہ مختلف ہے، جہاں تک مکاتیب شبلی کا تعلق ہے ان کے اندراجات اس وقت تک مورد شک و اعتراض نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ دوسرے ذرائع سے حاصل کیے ہوئے بیانات سے اختلاف کی کوئی صورت نمودار نہیں ہوتی، اسی

طرح اعزہ و احباب کے ذریعہ فراہم کردہ معلومات پر بھی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک نجی یا خاندانی معاملات کا تعلق ہے لیکن جب دو یا دو سے زیادہ بلند مرتبہ شخصیتیں معرضِ بحث میں ہوں اس وقت اس قسم کی روایتیں قبول کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، مثال کے طور پر شبلی کے سر سید احمد سے اختلافات کی داستان لیجئے، اس سلسلہ میں اقبال احمد سہیل ہوں یا سجاد حیدر مرحوم ان کی زبانی شہادت پر ایمان لانا ذرا مشکل کام ہے، سر سید احمد دعا کی تاثیر کے قائل نہ تھے، اعظم گڈھ کے ایک ہندو پوسٹ ماسٹر نے ان کے خیالات کی تردید بڑے مدلل طریق پر کی لیکن سر سید کے حلقہ میں شبلی پر اس رسالہ کے مصنف ہونے کا شبہ کیا گیا، اس شاذ روایت کے تنہا ملک اقبال احمد صاحب سہیل ہیں اور کسی دوسرے ماخذ سے اس کی تائید یا توثیق نہیں ہوتی، سجاد حیدر یلدرم کی سند پر سید صاحب نے شبلی سے عدم قابلیت کے بہانے سے کالج کے بعض درجے چھینے جانے کا ذکر کیا ہے، یہ اور اس قسم کی کئی اور روایات ہیں جن کا شمار شاذ کے زمرے میں ہے، ان زبانی روایتوں کے قبول کرنے میں احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے ثقہ راویوں کے بیانات میں اس درجہ تضاد پایا جاتا ہے کہ اچھے اچھے لوگ ان کے قبول یا انکار کرنے میں ہچکچاتے ہیں، مثال کے طور پر شبلی اور مفتی عبد اللہ ٹونکی کا واقعہ ذہنی کش مکش کا آئینہ دار ہے، مفتی صاحب نے کئی بار شبلی سے درس بخاری بند کر دینے پر اپنی مجبوری بیان کی لیکن بعد میں مفتی صاحب صاف انکار کر گئے[1] اسی طرح دوسرا واقعہ مولوی عبد الکریم کی چند روزہ عطلی کا ہے، مولانا عبد الباری فرنگی محلی اس معاملہ میں مولانا شبلی کے ہم نوا تھے لیکن جب اخبارات میں اس پہلے دے ہوئی تو مولانا عبد الباری نے

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۵۵۰، شبلی کے اصلی الفاظ یہ ہیں: "اب اگر مولانا موصوف (مفتی عبد اللہ ٹونکی) ان واقعات سے منکر ہوں تو خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون اس کا فیصلہ کرنے والا ہے؟"

اس فیصلہ سے اپنی بیزاری ظاہر کی یہاں تک کہ شبلی کو ان کے بیان کی تردید کرنا پڑی، اب جب اتنے بڑے بڑے مقدسین ایک ہی واقعہ کے سلسلہ میں اس درجہ متضاد بیانات شائع کریں تو بیچارے سادہ دل لوگ کس کی بات پر ایمان لائیں اور کس کے بیان کو ٹھکرائیں، مولانا شبلی کی تحریروں اور اشعار کی حیثیت بھی ایک فریق کے بیان کی سی رہ جاتی ہے جب نزاعی امور زیر بحث ہوں، مختلف میدانوں میں شبلی نے نبرد آزمائی کی ہے اور بعض اوقات ان کے حریف بڑے سخت کمان تھے جنھوں نے شبلی کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا، اندریں حالات ہمیں معاملہ کے مالۂ وماعلیہ پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کرنی چاہیئے، حیات شبلی کی تالیف کے دوران میں منشی محمد امین زبیری نے سید صاحب کی کافی حد تک امداد کی لیکن بعض صورتوں میں سید صاحب کے جادۂ عدل سے انحراف نے انہی منشی صاحب کو سید صاحب کے بعض بیانات کی تردید کرنے پر مجبور کر دیا۔

حیات شبلی کا درجہ بطور سوانح عمری کے

اردو زبان کی شاید سب سے پہلی محققانہ سوانح عمری حیات سعدی ہے، اس کے بعد مولانا حالی نے یادگار غالب لکھی لیکن ان دونوں کتابوں کے متعلق حالی کا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے کہیں پھوڑوں کو ٹھیس لگنے نہیں دی اور ان بزرگوں کے معائب اس لیے بیان نہیں کیے کہ لوگ شاید اس قسم کی تلخ مگر سچی باتیں سننے کے لیے تیار نہیں، حیات جاوید کے دیباچہ میں حالی نے صراحتہً لکھا ہے کہ سرسید کے بارے میں وہ اس قسم کی احتیاط روا نہ رکھیں گے اور رکھی بھی کیوں جاتی جب کہ خود سرسید تنقید کے حامیوں میں سے تھے اور ان کی تنقید کی زد سے بڑے بڑے بزرگ نہیں بچ سکے جس محنت، جانفشانی اور قابلیت کے ساتھ حالی نے حیات جاوید لکھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے نکتہ چینیوں کی رائے میں بھی وہ "اردو کی بہترین سوانح عمری" ہے حیات جاوید اس وقت شائع ہوئی جب شبلی علی گڈھ اسکول سے قطع تعلق کر چکے تھے اور بعض اسباب کی بناء پر سرسید اور ان کے دبستان خیال کے کھلم کھلا مخالف ہو چکے تھے، ظاہر ہے

کہ ان حالات میں انھیں مولانا حالی کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی کیونکر گوارا ہو سکتی تھی چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں اس کو "مدلل مداحی" اور "کتاب المناقب" کہہ کر پکارا ہے، حیات جاوید کے وہ اس پہلو سے کہ اس میں سرسیدؒ کی خامیاں اور کمزوریاں اچھی طرح بیان نہیں کی گئیں اس درجہ ناخوش تھے کہ جہاں کہیں انھیں موقع ملا انھوں نے اس پر نکتہ چینی کی، مناقب عمر بن عبدالعزیز پر ریویو[1] ہو یا ملا عبدالباقی نہاوندی کی مآثر رحیمی پر تبصرہ[2] انھیں اس بات کی شکایت ہے کہ ہمارے سوانح نگار معائب بیان کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور اگر کہیں ایک دو معمولی کمزوریوں کا ذکر کر بھی دیتے ہیں تو وہ اس لیے تاکہ ان کے ہیرو کی خوبیاں اور اجاگر ہوں، اس سلسلہ میں وہ اردو کی بہترین سے بہترین سوانح عمری کی طرف اشارہ کرتے ہیں، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ روئے سخن حیات جاوید کی طرف ہے،

آیئے دیکھیں، حیات شبلی بھی کہیں مولانا شبلی کی نکتہ چینی کا نشانہ تو نہیں بنتی لیکن پیشتر اس کے کہ مسئلہ کے اس پہلو پر غور کیا جائے اس کتاب کا تعارف اور اس کے محاسن کا تذکرہ بہت ضروری ہے،

بقول سید سلیمان صاحب حیات شبلی محض ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ مسلمانوں کے پچاس سالہ علمی قومی، ادبی، تعلیمی اور سیاسی واقعات کی تاریخ ہے، اسی قسم کا دعویٰ حیات جاوید کے متعلق بھی بلاخوف تردید کیا جا سکتا ہے؛ اس لیے کہ حیات جاوید ایک فرد واحد کی سرگزشت نہیں بلکہ ملک ہند میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی قومی سیاسی، ادبی اور تعلیمی زندگی کی تاریخ ہے، سرسید کی حیثیت قافلہ سالار کی تھی اور باقی بزرگ جن میں شبلی بھی شامل ہیں اس سردار قوم کے ممتاز ساتھی تھے

---

[1] مقالات شبلی جلد چہارم صفحہ ۶۵ و ۶۶ [2] ایضاً صفحہ ۸۱ ... "لیکن اس طریقہ کو ہم آج کل کے پرفریب طریقے سے زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں راست نویسی اور تنقید کا بہت کچھ دعویٰ کرکے بھی سوانح عمری کے بجائے مناقب کی کتاب لکھی جاتی ہے ... بہتر سے بہتر سوانح عمری جو ہماری زبان میں لکھی گئی ہے اس طریقے کی عمدہ مثال ہے"

ایک حد تک شبلی اور سرسید میں مماثلت پائی جاتی ہے، شبلی کی شخصیت بھی مختلف حیثیتوں کی حامل ہے، وہ بیک وقت مورخ، ادیب، شاعر، ناقد، متکلم، ماہر تعلیم اور سیاست داں تھے اور ان کی خداداد قابلیت کسی ایک گوشہ تک ہی محدود نہ تھی، اگرچہ سرسید کی طرح انھوں نے عملی سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا اور نہ ہی وہ کانگرس کے باقاعدہ رکن کبھی بنے تاہم انھوں نے اپنی قوت تحریر اور شاعرانہ قابلیت کے جوہر مسلمانوں کے لیے صحیح قسم کی سیاست کی راہ متعین کرنے کے سلسلہ میں دکھائے، مسلمانوں کی تعلیم سے خواہ جدید ہو یا قدیم انھیں ایک خاص دل چسپی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تعلیمی اسکیموں کے بنانے، درسی نصاب کی اصلاح کرنے اور عربی و فارسی کی اہمیت ثابت کرنے میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا، سیاسی حالات کے بدلنے سے جو صورت حالات پیدا ہو گئے تھے اس کے پیش نظر ان کی دوربین نگاہ قومی مقصد کے متعین کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئی، ان کی تصانیف نے مسلمانوں کو نہ صرف ان کی پرانی عظمت یاد دلائی بلکہ بعض مستعد نوجوانوں کے دلوں میں تحقیق اور تلاش کی امنگ بھی پیدا کر دی، ان کی شاعرانہ نواسنجیوں نے ایک غلغلہ بلند کر دیا، ان کی قوت تنقید کی بدولت شعرالعجم جیسی کتاب کا اردو میں اضافہ ہوا۔ قومی انجمنوں خاص طور پر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں ان کی تقریر کی ساحری نے ہزاروں دلوں کو مسحور کیا، غرض قومی زندگی کے ہر شعبے میں شبلی کا معتدبہ حصہ تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے سوانح نگار کو ان کے عہد کی سیاسی، قومی، علمی اور ادبی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت پڑی، اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں تو لامحالہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حیات شبلی اردو زبان میں ایک گرانقدر اضافہ ہے، چونکہ شبلی بلاد مشرق یعنی پورب کے رہنے والے تھے اس مناسبت سے سید صاحب نے وہاں کے علماء و فضلا کی مفید اور دل چسپ داستان بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ مرتب کی ہے اس مفصل داستان کے مفید ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن اس کی تفصیل اور درازی شاید بعض طبائع پر گراں گذرے، سید صاحب نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ ایک عقیدتمند شاگرد کی حیثیت سے

اپنے استاد کی ہنگامہ خیز زندگی کا ایک زندہ اور جاندار مرقع تیار کریں اسی لیے بعض اوقات انھیں جزئی تفصیلات میں جانا پڑا ہے تاکہ ایک مسئلہ کے تمام پہلو قارئین کے سامنے پیش کیے جاسکیں، شبلی کے خاندانی حالات ان کی تعلیم کی کیفیت، مولوی محمد فاروق چریاکوٹی جیسے استاد سے استفادہ، ان کے ابتدائی مشاغل اور رجحانات ان کی چند روزہ وکالت اور کچہری میں ملازمت پر نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ علی گڈھ میں ان کے علمی کارناموں اور مدرسہ ندوۃ العلماء میں ان کی تعلیمی اصلاحوں کو بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے، جن حالات نے مولانا شبلی کو ریاست حیدرآباد میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کیا ان کا مفصل ذکر کتاب میں موجود ہے، آخر میں ان کے اخلاق و عادات کا تفصیلی تذکرہ درج کتاب ہے، خود سید صاحب کو کتاب کی حوالت کا احساس ہے چنانچہ کتاب کے دلکش خاتمہ میں لکھتے ہیں:۔

"ناظرین! آپ نے نو سو صفحوں تک میری رفاقت کی، اس اثناء میں آپ کے اس شریک سفر اور رفیق نظر نے ایک مجسمۂ علم و فن اور پیکر خدمت دین و ملت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا، کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کمزوریوں کی چھائیاں بھی ہوں گی لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصویر کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آیئے ہم اور آپ اس کی دعا کیلئے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں اللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را"

اس حسن و جمال کے پیکر میں سید صاحب کی نظر بعض بشری کمزوریوں پر بھی پڑتی ہے، آیئے، دیکھیں کہ وہ کون سی بشری کمزوریاں ہیں جن کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ اسی نکتہ پر اس فیصلہ کا انحصار ہے کہ حیات شبلی کہاں تک مدلل مداحی اور کتاب المناقب ہے، کیا یہاں بھی اسی بات کا اعادہ نہیں کیا گیا جسے شبلی سخت ناپسند کرتے ہیں یعنی ہیرو کے دو چار معائب محض اس لیے بیان کیے جائیں تاکہ اس کے محاسن اور اجاگر ہوں؟ شبلی کی جن خامیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سر فہرست روحانیت کی کمی ہے، سید صاحب

کو اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی و اتقا اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہی نہیں تھا" حالانکہ وہ ایک دوسرے مقام پر بہایت صراحت کے ساتھ لکھتے ہیں[۲]: "خود فرائض دستن کے سخت پابند تھے اور دوسروں سے نہایت سختی کے ساتھ ان کی پابندی کراتے تھے .... دوسرے فرائض کا بھی نہایت شدت سے اہتمام کرتے تھے" ندوہ میں جس سادہ طریق پر شبلی زندگی گزارتے تھے اس کی تصویر سید صاحب کے قلم نے یوں کھینچی ہے[۳]: "مولانا کا پورا اثاثہ یہیں تھا، یہی خواب گاہ، یہی ملاقات کا کمرہ یہی دار المطالعہ اور یہی کھانے کا کمرہ، یہی مہمان خانہ سب تھا، ایک طرف پلنگ پر بستر تھا، باقی دری تھی جس پر وہ خود اور آنے جانے والے بیٹھتے تھے، مجھے بارہا حیرت ہوتی کہ وہ ہستی جس کے آوازہ سے سارا ہندستان معمور ہے وہ کیونکر ایک چھوٹے سے کرہ میں زندگی گزار رہا ہے اور اس خوبی سے کہ خود باغ و بہار، جو پاس بیٹھے وہ بھی شگفتہ ہو کر جائے، اور ان کا اثاثہ کیا تھا بستر اور کپڑوں کا ایک بکس، چائے کا مختصر سامان، لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور دو کرسیاں، باہر کچھ مونڈھے اور بس، غرض ان کی زندگی گویا حدیث نبوی کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل (دنیا میں تم ایسے رہو گویا مسافر ہو یا راہ سے گزر رہے ہو) کے مطابق تھی" سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایسا شخص جو فرائض اور سنن کا پابند ہو اور جس کی سادہ زندگی حدیث نبوی کے مطابق ہو روحانیت سے عاری کیونکر ہو سکتا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ سید صاحب کو شبلی کی تصنیفات میں بھی روحانیت کی کمی نظر آتی ہے اور تو اور شبلی کا شاہکار الفاروق بھی اس اعتراض سے بچ نہیں سکا، چنانچہ سید صاحب فرماتے ہیں[۴] کہ "الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے" ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے الگ ہونے کے بعد شبلی نے

---

۱ حیات شبلی صفحہ ۶۲۸، ۲ ایضاً صفحہ ۸۱۴، ۳ ایضاً صفحہ ۳۹ - ۷۳۸

۴ ایضاً دیباچہ صفحہ ۳۲

مولوی حمید الدین کے نام ایک خط میں یہ خواہش ظاہر کی کہ ان دونوں کو مل کر اعظم گڈھ یا سرائے میر کے مدرسہ پر اپنی تمام کوشش مرکوز کر دینی چاہیئے تاکہ وہ درس گاہ گورو کل کی طرح ہو، سید صاحب نے اس پر جو رائے ظاہر کی ہے اس میں پھر قارئین وہی روحانیت کی کمی کی طرف ایک باریک اشارہ پائیں گے چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں:[2] ...... "اس کی حقیقی کامیابی کے لیے خود بانی کی زندگی اور نقطۂ نظر میں جو اصلی تبدیلی چاہیئے تھی وہ ہنوز پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی، اس کے لیے وقت درکار تھا، اس کے لیے گورو کل پر جذبۂ رشک سے ہٹ کر خود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور اپنے بزرگان دین اور آئمہ ہدیٰ کی نظیریں سامنے رہنی چاہیئے تھیں، مولانا نے اشاعت و تبلیغ اسلام کے کاموں میں جتنی کوششیں بھی فرمائیں ان کی تہ میں یہ کمی ہمیشہ محسوس ہوتی رہتی" ایک طرف مولانا شبلی کو فرض و سنت کا پابند بتایا جاتا ہے اور دوسری ان میں روحانیت کی کمی کو بار بار بیان کیا جا رہا ہے، آخر سید صاحب کے بیانات میں اس درجہ تضاد کیوں پایا جاتا ہے، اس تضاد کی نشو و نما تھانہ بھون کی مقدس سرزمین میں ہوتی ہے مولانا اشرف علی تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سید صاحب کے نقطۂ نظر میں ایک غیر معمولی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے، وہ اب ہر چیز کو روحانیت کے پیمانہ سے ناپنے کے لیے بیتاب ہیں اور جہاں ان کو اپنے پیر و مرشد کے مسلک سے ذرا سا انحراف بھی نظر آتا ہے ان کا اعتراض اس پر موجود ہے خواہ یہ انحراف ان کے استاد شبلی میں ہی کیوں نہ پایا جائے، شبلی کی زندگی میں بھی بعض معترض روحانیت کی اس کمی پر زور دیا کرتے تھے لیکن شبلی کے نزدیک اس اصرار کی حقیقت محض ریاکاری تھی چنانچہ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:[2] "آج کل کے ریاکاروں نے دوسروں سے بدگمان کرنے کے لیے بہت سے الفاظ تراشے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ فلاں شخص میں روحانیت نہیں، فلاں شخص عالم ہے لیکن دیندار نہیں لیکن ان ہی دینداروں کو ہمیشوں دیکھا ہے کہ نماز فجر کبھی نصیب نہیں ہوتی، باوجود اس کے ان کی دینداری

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۵۷۵، [2] دیباچہ صفحہ ۱۴

روحانیت میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا" شبلی کے یہ الفاظ جس طرح ان کے اپنے زمانے کیلئے درست تھے اسی طرح آج بھی درست ہیں، کیا سید صاحب بتا سکتے ہیں کہ شبلی کے رفقائے کار میں سے کتنے جنید و ذوالنون تھے، واقعہ یہ ہے کہ شبلی کے خلاف یہ تمام ہنگامہ آرائی ان حضرات کی طرف سے تھی جو مسلک آبا پر سختی کے ساتھ گام زن تھے اور زمانے کے تقاضوں سے بے خبری کے باعث اس مسلک میں کسی قسم کی تبدیلی کے لیے تیار نہ تھے، سید صاحب کے نزدیک شبلی کی سیرت کی سب سے بڑی خامی روحانیت اور تقدس کی کمی تھی لیکن ان کی یہ رائے اپنے محسن استاد کے بارے میں تھانہ بھون کا فیض ہے ورنہ اس سے پہلے وہ شبلی کو روحانیت سے اس درجہ بیگانہ نہیں پاتے تھے، جب سیرۃ النبی کی پہلی جلد شائع ہوئی تو سرورق پر مولانا شبلی کے نام کے پہلے حجت الملّت والدین کے معزز لقب کا اضافہ کیا تھا، حجت الاسلام کے لقب سے امام غزالی ممتاز ہیں، شبلی کی وفات پر جو مضمون ان کے ارشد تلامذہ کے قلم سے شائع ہوا اس کا ایک ٹکڑا ہمارے نقطۂ نظر کا موید ہے، جس مبالغہ آمیز انداز میں سید صاحب نے شبلی کی تعریف کی ہے اس کے ساتھ شاید ہی کسی انصاف پسند کو اتفاق ہو سکتا ہے:۔

"ہندستان کی سر حاصل زمین نے فقہ و حدیث میں صغانی، علی متقی، شیخ عبدالحق، کلام و اسرار شریعت میں بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ، ادب و معانی میں عبدالمقتدر، ملک العلماء اور ملا محمود، فلسفہ و منطق میں ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ، ادب و شاعری میں مسعود سلمان، خسرو اور فیضی، تاریخ میں برنی، ابوالفضل، آزاد بلگرامی کو پیدا کیا لیکن اس کی آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ تھا جو عبدالحق

ملے ۱۹۴۸ء میں سید صاحب اپنے استاد محترم کو الاستاذ المورخ الامام کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو امام ابن تیمیہ کی الرد علی المنطقین کا عربی مقدمہ) لیکن ۱۹۱۶ء میں وہ اپنے استاد کو "دور تجدید و احیاء میں ہندستان کے مجدد اعظم" کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ (معارف دسمبر ۱۹۱۶ء)

بھی تھا اور شاہ ولی اللہ بھی، ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی تھا اور آزاد بھی اور کم، نہ کم وہ یگانہ انفراد آان میں سے اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے بہتر تھا"۔ سید صاحب کا یہ بیان پڑھ کر آدمی ششدر رہ جاتا ہے، بھلا حدیث اور اسرار شریعت میں شبلی کو شیخ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ سے کیا نسبت، صغانی کے علم وفضل کی بہترین شاہد اس کی عربی لغت پر دو ضخیم کتابیں العباب اور مجمع البحرین ہیں، مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو اقلیم سخن کے تاجدار ہیں، ان کے مقابلہ میں شبلی کا نام لینا انصاف کا خون کرنا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اپنے ممدوح کی تعریف کرتے وقت مبالغہ طرازی سے اجتناب نہیں کرتے، ۱۹۱۹ء میں "نظر بند ان اسلام" کے عنوان سے انھوں نے ایک سلسلہ مضامین معارف میں لکھا، ضروری تھا کہ اس مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ بھی کیا جاتا، مولانا آزاد کے علمی تبحر، اصابت رائے اور بلندیٔ فکر کے قائل ان کے معتقد ہی نہیں بلکہ نکتہ چیں بھی ہیں لیکن جس انداز میں سید صاحب نے ان کی تعریف کی ہے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، سید صاحب کا شاعرانہ مبالغہ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:- [1] "ان سطروں کے لکھتے وقت ہم کو یہ دھوکہ ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہ اور ابن قیم یا شمس الائمہ سرخسی یا امیہ بن عبدالعزیز اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں"۔ امام ابن تیمیہ کس پایہ کے بزرگ تھے اس کا اندازہ مولانا ابوالکلام کے تذکرہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کا ایک حصہ ابن تیمیہ کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان کے علمی کمالات کا تعارف ایک بڑی حد تک مولانا ابوالکلام کے زور قلم کا نتیجہ ہے کوئی تعجب نہیں اگر علامہ شبلی بھی مولانا آزاد کے زیر اثر امام ابن تیمیہ کے کمالات کے قایل ہوئے ہوں، شبلی کی اس رائے کے بعد کہ [2] "مجھے اس شخص (ابن تیمیہ) کے سامنے رازی وغزالی سب ہیچ نظر آتے ہیں" سید صاحب کا مندرجہ بالا بیان مبالغہ واغراق کی بہت اچھی مثال ہے،

---

[1] معارف مارچ ۱۹۱۹ء [2] حیات شبلی صفحہ ۸۳۰

روحانیت کی کمی کے علاوہ، شبلی کی جن خامیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان کا تعلق شبلی کی سیرت سے زیادہ ان کی تصانیف اور آراء سے ہے، مثلاً الغزالیؒ، سوانح مولانا روم، علم الکلام اور الکلام میں سید صاحب کو دو کمیاں محسوس ہوتی ہیں، (۱) جدید علوم کے متعلق مولانا شبلی کی معلومات ثانوی اور سرسری تھیں (۲) کتاب و سنت کے بجائے متکلمین اور حکمائے اسلام کی کتابوں کی طرف رجوع کیا گیا، پہلی کمی کے بارے میں سید صاحب کا ارشاد بجا ہے لیکن جن مباحث پر علم الکلام اور الکلام حاوی ہیں ان کی تلاش اگر متکلمین اور حکمائے اسلام کی تصنیفات میں نہ کی جاتی تو کہاں کی جا سکتی تھی، الفاروق میں سید صاحب کے نزدیک ایک خامی تو یہ ہے کہ "اس میں حضرت عمرؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے" دوم "اس میں بعض اغلاط کا وجود اور بعض جوابی نظریوں کی کمزوری بھی مصنف کی بشریت کی حامل ہے" اسی طرح، دیباچہ کے صفحہ ۸۴ کے حاشیہ میں الغزالی میں احیاء العلوم کے ایک غلط حوالے کی طرف سید صاحب اشارہ کرتے ہیں،

سرسید کی مدح میں شبلی نے ایک قصیدہ عربی میں لکھا تھا جس میں سید صاحب کے خیال میں "فن کی بعض کمزوریاں" ہیں، شبلی نے تین چار صفحوں کا ایک مضمون "خلافت" پر علی گڑھ کالج میگزین میں لکھا جس میں انھوں نے یہ بتانا چاہا کہ ترکوں کا دعوائے خلافت قابل تسلیم نہیں، سید صاحب کی رائے میں شبلی کا یہ مضمون آورد تھا آمد نہ تھا، ۱۹۰۸ء میں شبلی نے الندوہ میں ایک مضمون لکھا کہ "مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیونکر رہنا چاہیئے" اس مضمون کو سید صاحب اس امداد کی قیمت بتاتے ہیں جو حکومت نے دارالعلوم ندوہ کو دینی منظور کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں کہ شبلی نے ردالمختار کی عبارت کا غلط مفہوم لیا ہے، الکلام میں ایک جگہ شبلی نے لکھا ہے کہ اسلام کا ایک بڑا فرقہ معتزلہ مادہ کو قدیم مانتا ہے، اس کے متعلق سید صاحب کا ارشاد ہے

۱؎ دیباچہ صفحہ ۲۱ و ۲۲ ۲؎ حیات شبلی دیباچہ صفحہ ۳۲ ۳؎ حیات شبلی صفحہ ۳۲ ۴؎ ایضاً صفحہ ۶۳۱

کہ "یہ[1] مولانا کا سہو قلم ہے، معتزلہ مادہ کو قدیم نہیں حادث مانتے ہیں"

قارئین کرام بشری کمزوریوں کی فہرست ملاحظہ کر کے خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس قسم کی خامیاں شبلی ایسے جلیل القدر انسان کیلئے کہاں تک موجب منقصت ہو سکتی ہیں، شبلی کی علمی وادبی عظمت سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن جس پیرایہ میں سید صاحب نے اپنے استاد کی برتری اور فوقیت ان کے عظیم المرتبت معاصرین پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اسے ایک غیر جانبدار اور انصاف پسند شخص کیونکر تسلیم کر سکتا ہے، جس قافلہ کے شبلی ایک نامور رکن تھے اس کے سالار یقیناً سر سیّد احمد تھے لیکن حیات شبلی کے اوراق میں شبلی کو سر سیّد کا حریف اور مقابل بتایا گیا ہے اور ان کے مابین اختلافات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کی گئی ہے، سید صاحب کا قیاس ہے کہ سر سیّد کی وفات پر شبلی کا مرثیہ نہ لکھنا انہی اختلافات کی وجہ سے تھا، حالاں کہ جب تک سر سیّد زندہ رہے مولانا شبلی ان کے دامن عاطفت کے ساتھ وابستہ رہے اور کیوں نہ رہتے جب کہ وہ سر سیّد کی جلالت قدر کے قائل تھے، یہ سچ ہے کہ انھوں نے سر سیّد کے انتقال پر کوئی مرثیہ نہیں لکھا لیکن جس درد انگیز پیرایہ میں انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ایک عربی خط میں کیا ہے وہ کئی مرثیوں سے بڑھ کر ہے، یہ خط نواب علی حسن خاں کے نام لکھا گیا تھا۔ تَضَعْضَعَتْ ارکان الملة اعنی اِنْتَقَلَ السید اَحمدُ خَان بهادر الی جوار رحمة ربّہٖ وذلک یوم الاحد، ۲۷ مارچ وتفرق شملُنا اِنّی لا اقدر علی ان اشتغل بشئ الابعد برهة من الزمان[2] (قومی عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کے جوار رحمت میں چلے گئے اور یہ سانحہ یک شنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا، میں کچھ دنوں

---

[1] دیباچہ صفحہ ۲۱ و ۲۲ [2] حیات شبلی صفحہ ۳۲ - ۳۳۱

تک کوئی کام نہیں کر سکتا)، ایک مرحوم بزرگ کو اس سے بڑھ کر کیا خراج تحسین ادا کیا جا سکتا ہے، شبلی کی اس تحریر پر مدرسۂ ڈابھیل کے مدرس مولوی محمد یوسف بنوری[1] نے بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے اور سر سید کے ساتھ ساتھ شبلی کو بھی طعن و اعتراض کا نشانہ بنایا ہے۔ سید صاحب یہ فرض کرنے میں حق بجانب نہیں ہیں کہ محض اختلاف خیال کی بناء پر سر سید اور شبلی کے تعلقات کشیدہ تھے، آج خود سید صاحب کو اپنے استاد کی متعدد باتوں سے اختلاف ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سید صاحب کے دل میں شبلی کا واجبی احترام نہیں رہا، واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب نے ان اختلافات کے بیان کرنے میں غیر جانبداری سے کام نہیں لیا بلکہ استاد کی برتری ثابت کرنے کی کوشش میں انصاف کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے شاذ روایات تک کا سہارا ڈھونڈھا ہے، قدرتی طور پر یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آیا سید صاحب پہلے سے ہی سر سید احمد کے بارے میں ایسے خیالات رکھتے ہیں یا یہ تبدیلی بھی تقدس اور روحانیت کی بدولت ان میں پیدا ہو گئی ہے، شبلی کی وفات کے بعد جو مضمون انھوں نے لکھا تھا اس سے یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ آج سے تیس تینتیس برس پہلے سر سید کے متعلق اتنی گری ہوئی رائے نہیں رکھتے تھے، اس مضمون کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

"ہندوستان[2] کا دور اصلاح جن افراد پر مشتمل تھا ان کا سر عسکر یقیناً وہی تھا جس کے بوڑھے غمزوں میں صد کرامات پنہاں تھی اور جس کی ریش سپید کی درازی سمر کی چھٹکی ہوئی چاندنی تھی، سر سید احمد خاں، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی صاحب ...... مولانا الطاف حسین حالی اور سب سے آخر خاتمۃ المصلحین حجت الملت والدین شمس العلماء مولانا شبلی اس دور کے ارکان عظام تھے۔"

---

[1] مشکلات القرآن کا مقدمہ صفحہ ۳۲ و ۳۳، [2] معارف دسمبر ۱۶ء

حیاتِ شبلی کی ایک خصوصیت جسے ہر پڑھنے والا محسوس کرتا ہے وہ شبلی کی ادبیات کا شمار ہے سید صاحب نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ تمام ادبیات کا سہرا ان کے استاد کے سر رہے اور اگر کوئی حریف اس اعزاز میں شبلی کا شریک ہو سکتا ہے تو اسے نیم عالم کہہ کر اس استحقاق سے محروم کر دیا جائے، سرسید مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی جونپوری کے کارہائے نمایاں اسلام کی حمایت اور مخالفوں کی تردید میں ایسے ہیں کہ انھیں بآسانی فراموش نہیں کیا جاسکتا، خاص طور پر سرسید کی خطبات احمدیہ جو صوبجات شمال مغربی کے گورنر کی کتاب کا جواب ہے اپنی صمیمیت اور خلوص کی بناء پر اردو زبان میں بے نظیر ہے لیکن سید صاحب ان بزرگوں کے کارناموں کی قدر و قیمت اس طریق پر کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، "چونکہ وہ باقاعدہ عالم نہ تھے اور نہ علمائے حق کی صحبتوں سے مستفید تھے، انھوں نے اپنے کاموں میں جگہ جگہ غلطیاں کیں اور ایسی تاویلوں کے شکار ہوئے جو حقیقت سے بہ مراحل دور تھیں"[1] خدا جانے سید صاحب کے پاس وہ کون سا معیار ہے جس کے ذریعہ وہ لوگوں کی قابلیت جانچتے ہیں، اگر ایک عالم کی تصنیفات اس کے علم کی شاہد نہیں ہیں تو نہ معلوم اس کے سوا کون سی کسوٹی ہے جس پر کسی شخص کی قابلیت کے جوہر کو پرکھا جاسکے، سرسید اور مولوی چراغ علی کے علمی کارنامے ان کی قابلیت کے بہترین شاہد ہیں لیکن سید صاحب کے نزدیک یہ بزرگ نیم عالم تھے اور کسی پیرِ طریقت کے فیضان سے محروم، تقریباً اسی قسم کا سلوک سید صاحب نے پروفیسر محمود خاں شیرانی کے ساتھ روا رکھا ہے، ان کی وفات پر ایک نوٹ کے دوران میں فرماتے ہیں کہ شیرانی صاحب کی فارسی تعلیم متوسط تھی تو ہم اس خوش قسمت کا نام جاننا چاہتے ہیں جس کی تعلیم سید صاحب کے نزدیک اعلیٰ ہو، اس سے بھی زیادہ سخت سید صاحب کی رائے مولوی عبدالرزاق کانپوری کی علمیت کے بارے میں ہے۔ مرحوم کے انتقال پر اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے

---

[1] حیاتِ شبلی دیباچہ صفحہ ۱۶

سید صاحب ان کی عربی دانی کی کیفیت اس طرح بیان کرتے ہیں[1] کہ مرحوم عربی کتابوں میں جہاں کہیں برامکہ کا لفظ دیکھتے تھے اسے نوٹ کر کے اس کا مفہوم دریافت کر لیا کرتے تھے، سید صاحب یہاں تک فرماتے ہیں کہ البرامکہ میں تمام عربی اشعار کا اردو ترجمہ حکیم عبدالحی صاحب گل رعنا کا کیا ہوا ہے، اس قسم کا سخت بیان اور وہ بھی مولوی عبدالرزاق کے انتقال کے بعد نہایت ہی غیر منصفانہ ہے، سید صاحب نے ایک جگہ اپنے استاد کی زبانی روایت کیا ہے کہ سر سید نے اشارات کے ایک مشکل مقام کو جسے وہ خود نہیں سمجھ سکتے تھے شبلی سے توضیح چاہی تو شبلی کی زبان سے بے اختیار یہ جملہ نکل گیا کہ آپ اسے سمجھ بھی نہیں سکتے[2] تھے، شاید یہ واقعہ سر سید کے نیم عالم ہونے کے ثبوت میں نقل کیا گیا ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہو جب بھی سر سید کی نیم علمی پر دال نہیں ہے اس لیے کہ خود شبلی کا بیان ہے کہ باوجود فلسفہ کے مطالعہ کے وہ امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ کو نہ سمجھ سکے اور جب انھوں نے اپنے استاد مولوی محمد فاروق چریاکوٹی سے اسے سمجھنا چاہا تو وہ بھی کترا گئے[3]، مولانا شبلی کے اپنے الفاظ یہ ہیں، "میں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہا، باوجود اس کے میری سمجھ میں وہ کتاب نہیں آئی، مولوی فاروق صاحب سے پڑھنا چاہا وہ بھی کترا گئے، میں نے چند دفعہ الغزالی کے کئی کئی صفحے لکھ کر اسی خیال سے چھوڑ دیے کہ ان کتابوں پر ریویو نہ ہو سکا تو کیا فائدہ"۔

شبلی کی اوّلیات گنانے میں سید صاحب عدل کو قائم نہیں رکھ سکے، وہ ان کے نزدیک عہد جدید کے معلّم اوّل ہیں، مستشرقین اور عیسائیوں کے مقابلہ میں جو "شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے"، فارسی زبان میں نئی شاعری کی بنیاد شبلی نے ڈالی، "آج کل اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا مسالہ کہاں سے ہاتھ آ رہا ہے؟ الفاروق

---

[1] معارف مارچ ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۰۳ [2] حیات شبلی صفحہ ۱۲۶ [3] ایضاً صفحہ ۳۶۹ و ۳۷۰

سے علماء میں وہ پہلے شخص تھے جس نے وقت کی سیاسی باتوں میں دلچسپی لی، ہندوستان میں وہ عالم گیر اتحاد کے داعی اول تھے، سیاسی مسائل سے حضرات علماء کو جو دلچسپی ہے وہ شبلی کی پکار کا نتیجہ ہے ہندوستان میں صدر الصدوری یا شیخ الاسلامی یا امارت شرعیہ کی جو تحریکیں بعد کو اٹھیں وہ بھی شبلی کی صدائے بازگشت ہے۔

ناظرین خود ملاحظہ کر سکتے ہیں کہ مندرجہ بالا سب باتیں شبلی کی ادبیات میں محسوب نہیں ہو سکتیں لیکن یہ سچ ہے کہ شبلی کو جامعیت کا شرف حاصل ہے۔

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ سید صاحب اپنی تحریروں میں بعض اوقات شاعرانہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں، اس قسم کی مبالغہ طرازی کی کئی مثالیں حیات شبلی میں موجود ہیں۔

"مصر کے عیسائی مورخ جرجی زیدان نے "تمدن اسلامی" کے نام سے چار پانچ جلدوں میں اسلامی تمدن کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کی تیسری جلد اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر ہے، بدگمانی نہیں کرتا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہی رسائل اس کے سامنے تھے اور ان ہی کو دیکھ کر اسی رنگ سے (واقعات کے حوالوں کی مدد سے جو رسائل کے حاشیوں پر لکھے ہوئے تھے) اس نے یہ مرقع تیار کیا ہے۔"

عام اردو داں طبقہ شاید سید صاحب کا یہ بیان پڑھ کر آمنّا و صدّقنا پکار اٹھے لیکن ہر وہ شخص جس نے رسائل شبلی اور تاریخ التمدن الاسلامی دونوں کو ایک سرسری نظر سے بھی دیکھا ہو اس بیان کی تصدیق کیونکر کر سکتا ہے، رسائل شبلی مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے صرف بعض کا تعلق اسلامی علوم و فنون سے ہے لیکن جرجی زیدان نے ایک پوری جلد اس کے لیے وقف کر دی ہے، رسائل شبلی کے آخذ نادر مخطوطات نہیں تھے جہاں تک بیچارے جرجی زیدان کی رسائی نہ ہو سکتی تھی اس بناء پر کہ تاریخ تمدن اسلامی لکھتے وقت رسائل شبلی

۱- حیات شبلی صفحہ ۵۵۳ ۲- ایضاً صفحہ ۲۳۰

کا ایک نسخہ اس کے پیشِ نظر تھا یہ گمان کرنا کہ ان ہی رسائل کو دیکھ کر اسی رنگ سے اس نے یہ مرقع تیار کیا ہے درست معلوم نہیں ہوتا، واقعہ یہ ہے کہ اسلامی علوم وفنون کی تاریخ مرتب کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں، اس کام کو قرار واقعی انجام دینے کے لیے کئی اہلِ علم کا تعاون ضروری ہے خود شبلی کو اس بات کا اعتراف ہے، جرجی زیدان کی علمی کم مایگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کس حسرت سے لکھتے ہیں[1]:۔ "امّا تاریخ العلوم الاسلامیہ والتقریظ علیھا فقد فقدنا الیوم فی ملتنا من یقوبھن العباء"

سیرت کی مقبولیت میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن سید صاحب کے خامۂ سحر نگار سے اس مقبولیت کی داستان سننے کے لائق ہے، دیباچہ کے صفحہ ۲۵ پر فرماتے ہیں:۔

"وہ زبان جس میں ان کے اعلان سے پہلے صرف میلاد نامہ کی قسم کے رسالوں اور ایک آدھ کتاب تواریخ حبیب اللہ کی پرانی طرز کی سیرت کے سوا کوئی ایک کتاب بھی موجود نہ تھی صرف پیروی کی برکت سے پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں کے دفتر سے معمور ہو گئی، اس کوشش میں مقدس علماء بھی شریک ہو گئے۔ نئے تعلیم یافتہ اہلِ قلم بھی، گم کردہ راہ مدعی اسلام فرقے بھی"

اس بیان کی مبالغہ طرازی واضح ہے، سیرت النبیؐ سے پہلے اردو زبان بجا طور پر تذکرۂ مصطفےٰ اور رحمۃ للعالمین جیسی کتابوں پر فخر کر سکتی تھی، پھر اس سلسلہ میں سرسید احمد کی خطبات احمدیہ کو کیونکر فراموش کیا جا سکتا ہے جو سر ولیم میور کی "حیات محمد" کا کامیاب اور معقول جواب تھی اور جو اپنے خلوص اور حمیمیت کے اعتبار سے ایک خاص امتیاز کی مستحق ہے، مندرجہ بالا بیان کی دوسری شق پر ذرا غور کریں تو اس کی مبالغہ آمیزی خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہے، وہ کون سی ہزاروں کتابیں ہیں جو سیرت النبیؐ

---

[1] الانتقاد صفحہ ۷

کے بعد اردو میں لکھی گئیں، چند مشہور اور اہم کتابوں کے نام ضرور گنائے جا سکتے ہیں:

اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے سید صاحب کے بیان کے مطابق ۱۹۰۵ء میں وہ شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات[1] ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا" شبلی کی خلوت وجلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہنے اور اپنی مستقل فطری صلاحیتوں کی بدولت مولانا ابوالکلام نے ترقی کی منزلیں طے کیں، سید صاحب کے اپنے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام کا قیام شبلی کی صحبت میں بہت مختصر تھا تاہم یہ محل تعجب نہیں کہ شبلی ایسے عالم اور محقق کا اثر نوجوان ابوالکلام پر پڑا ہو لیکن سید صاحب کا یہ ارشاد قبول کرنے میں ذرا ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے کہ اتحاد اسلامی اور وطنی سیاست میں کانگریس کی ہمراہی بھی شبلی کا فیض صحبت ہے، اس معاملہ میں ہمیں شبلی کے ایک ناقد کا ہم خیال ہو کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ سیاست میں نوجوان ابوالکلام نے شبلی کو متاثر کیا اور یہ غالباً ان ہی کی زبردست شخصیت کا اثر تھا کہ شبلی نے "جادۂ سید" سے کامل انحراف اختیار کیا، پھر شبلی کی زندگی میں ایسے لمحے بھی آئے جب کہ خارزار سیاست میں استقلال نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور ان سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوئیں جو بقول سید صاحب 'آورد' تھیں 'آمد' نہ تھیں، ان کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد نے زمانے کی تمام ناسازگاریوں کے باوجود جس شاندار استقامت اور استقلال کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو قرآن حکیم سے جو عشق ہے وہ سب پر عیاں ہے، سید صاحب اس عشق کو مولانا حمید الدین فراہی کی چند روزہ صحبت کا نتیجہ بتاتے[2] ہیں، یہ ایک ایسا یک طرفہ بیان ہے جس کی تائید و توثیق مولانا آزاد نے کبھی نہیں کی۔

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۴۴۴ [2] ایضاً صفحہ ۴۴

حیات شبلی میں غلط تاویل کی بھی بعض مثالیں پائی جاتی ہیں، اس دور میں جب کہ شبلی ایک غالی حنفی تھے انھوں نے حنفیت کی تائید میں ایک رسالہ ظل الغمام فی مسئلة القراءت خلف الامام کے نام سے اردو زبان میں لکھا تھا، حیات شبلی میں[1] اس کتاب کا مقدمہ نقل کر کے سید صاحب مندرجہ ذیل نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱) علی گڑھ جانے سے پہلے ہی مولانا کے قلم میں اردو انشا پردازی کا کتنا زور تھا۔

(۲) دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ سرسید کی ملاقات اور ادبی تاثر سے پہلے بھی کس قدر تھا۔

(۳) اس سے ان کا وہ تاثر ظاہر ہوتا ہے جو اس نازک زمانے میں باہمی فرقہ آرائیوں سے ان کے دل کو پہونچا تھا۔

شبلی کا زور انشا پردازی مسلم، دماغ اور تحریر کا سلجھاؤ بھی تسلیم لیکن تیسری شق ایسی ہے جسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا، علی گڑھ پہونچنے سے پہلے شبلی کی دماغی صلاحیتوں کے اظہار کا سب سے بڑا میدان احناف اور اہل حدیث کی باہمی کشمکش تھی، شبلی اس میدان کے مرد تھے اور حریفوں کو نیچا دکھانا ان کا محبوب مشغلہ تھا، ایک ایسے مناظرے کے دلدادہ کے لیے یہ کہنا کہ باہمی فرقہ آرائیوں سے ان کے دل کو دکھ ہوا تھا انصاف سے بعید ہے، فرقوں کی اس کشمکش میں شبلی کی انتہا پسندی کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں مولانا عبدالحی فرنگی محلی کی معتدل روش تک ناپسند تھی چنانچہ رسالہ[2] اسکات المعتدی، میں انھوں نے مولانا عبدالحی کی تحقیق کی تردید کی

اب ذرا پہلی دو شقوں پر بھی ایک نظر ڈالیے، فرض کیجئے کہ شبلی علی گڑھ میں سرسید کے زیر اثر نہیں آتے اور صرف مولانا فاروق چریا کوٹی کے دامن سے وابستہ رہے ہوتے تو ان کی خداداد قابلیت کا مصرف کیا ہو سکتا تھا؟ وہ محض ایک مولوی ہوتے، شبلی نہ ہوتے۔

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۱۰۴

خطوط شبلی میں مولانا کے سوانح نگار کے لیے تھوڑا بہت مواد موجود ہے اور چونکہ انہی خطوط کی بناء پر بعض مضامین مثلاً "شبلی اور بمبئی" اور "شبلی کی داستان معاشقہ" لکھے گئے ہیں اس لیے سید صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس سلسلہ میں بعض غلط فہمیوں کا پردہ چاک کرتے اور بتاتے کہ مضمون نگاروں نے کس کس چیز میں شبلی کے ساتھ بے انصافی کی ہے، بجائے اس کے کہ وہ اس معاملہ پر پوری روشنی ڈالتے انھوں نے اسے نظر انداز کر دینے میں مصلحت سمجھی چنانچہ شبلی کے اس شعر کی تاویل ما لا یرضٰی قائلہٗ کے مطابق بڑے دلچسپ طریق پر کرتے ہیں:۔

آں شد اے دوست کہ در بندوہ بمبئی بازم که دم از صحبت آں دشمن ایماں زدہ ام

سید صاحب فرماتے ہیں:۔

"وہ لوگ[1] جن کی سخن فہمی صرف حرفی ہے وہ غلطی سے اس "دشمن ایمان" کی تلاش بمبئی میں کرتے ہیں حالانکہ وہ علی گڈھ میں تھا"

اس تاویل کو پڑھ کر آدمی دم بخود رہ جاتا ہے، اتنی صریح اور واضح بات کی یہ دور از کار تاویل کہاں تک بجا ہے اس کا فیصلہ ناظرین کرام خود کر سکتے ہیں۔

حیات شبلی میں بعض واقعات کی غلطیاں بھی ہیں جنھیں نظر و قلم کے سہو پر محمول کیا جا سکتا ہے، مثلاً کتاب کے صفحہ ایک پر سید صاحب رقم طراز ہیں کہ

"تیسری صدی کا خاتمہ تھا کہ غزنی میں ترکوں کی ایک نوجوان تازہ دم قوم نے جو ابھی ابھی اسلام کے نام سے آشنا ہوئی تھی اپنی سلطنت کی طرح ڈالی، اس کا پہلا بانی الپتگین اور اس کا جانشین سبکتگین ہوا"

تیسری صدی کے خاتمہ کے بجائے چوتھی صدی ہجری کا وسط چاہیئے جب کہ الپتگین غزنی میں

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۴۵۲

حکومت کرتا ہے، اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق جانشین ہوتا ہے نہ کہ سبکتگین، ورجیسا کہ ڈاکٹر ناظم نے اپنی کتاب "محمود آف غزنہ"[1] میں بتایا ہے تین جانشینوں کے بعد سبکتگین کی باری آتی ہے۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے تذکرہ کے ضمن میں سید صاحب لکھتے ہیں[2]:-

"اس کے بعد المرأۃ المسلمہ کے نام سے مصر کے قاسم امین بے اور فرید وجدی نے مسلمان عورتوں کی بے پردگی اور پردہ پر جو کچھ لکھا تھا اس پر مفصل تبصرہ لکھا جو الندوہ کے کئی نمبروں میں چھپا ہے"

قاسم امین بے نے آزادیٔ نسواں کی حمایت میں دو کتابیں لکھیں، تحریر المرأۃ (عورت کو آزاد کرانا) اور المرأۃ المسلمہ لکھی جس کا اردو ترجمہ مولانا ابو الکلام نے کیا اور جسے کتابی صورت میں اخبار وکیل امرتسر نے شائع کیا، یہی وہ ترجمہ ہے جسے ہمارے ایک عزیز دوست نے حال ہی میں مولانا موصوف کی اجازت کے بغیر "مسلمان عورت" کے نام سے دوبارہ شائع کیا ہے، ترجمہ جس خوبی سے کیا گیا ہے اس سے اصل کا شبہ ہوتا ہے۔

اوکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مارگولیتھ کو کیمبرج یونیورسٹی[3] کا پروفیسر بتایا گیا ہے، یہ غالباً سہو قلم ہے، اسی طرح مشہور معتزلی عالم ابو الہذیل علاف کو ہذیل علاف[4] لکھا گیا ہے، اسے بھی سہو قلم ہی سمجھنا چاہیئے۔

حیات شبلی کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالنے کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کہاں تک مدلل مداحی اور کتاب المناقب ہے، شبلی کے اوصاف و محاسن کو بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ان کی دو چار کمزوریوں کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ اس لیے حیات شبلی کے کتاب المناقب ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، آخر یہ کیا ضرور ہے کہ محاسن اور معائب کا توازن قائم رکھ کر ہیرو کی داستان کو کتاب المحاسن و المساوی بنا دیا جائے، حیات شبلی میں

---

[1] محمود آف غزنہ صفحہ ۲۶ و ۲۷ [2] حیات شبلی صفحہ ۴۴۴ [3] ایضاً صفحہ ۳۰ [4] ایضاً صفحہ ۴۴

مدلل مداحی سے بھی کافی کام لیا گیا ہے اور بہت سے نزاعی اور اختلافی امور میں پوری قوت دلائل کے ساتھ شبلی کے طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے لیکن اس بحث میں سید صاحب کی حیثیت بعض اوقات محض ایک طرفدار کی سی رہ جاتی ہے اور وہ ایک کامیاب مناظر کی طرح مسئلہ کے صرف ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں جو ان کے مفید مطلب ہیں، اس قسم کے طرز عمل کا ردعمل ہمیشہ سخت ہوتا ہے، اگر بعض عظیم المرتبت شخصیتوں کے متعلق سید صاحب نے یہ طریق بحث اختیار نہ کیا ہوتا تو شبلی نامہ اور ذکر شبلی جیسی کتابیں کبھی نہ لکھی جاتیں خاص طور پر جب کہ ذکر شبلی کے مصنف نے حیات شبلی کی تالیف کے دوران میں بھی سید صاحب کی امداد کی تھی جیسے کہ وہ خود شبلی کی زندگی میں ان کی مختلف طریقوں سے مدد کرتے رہے تھے۔

کتاب کے سرورق پر حیات شبلی کو علامہ شبلی کے سوانح حیات اور علمی و عملی کارنامے بتایا گیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی کے علمی اور عملی کارناموں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ان کی تعریف و تحسین کے ساتھ تنقید کا فرض بھی ادا کیا گیا ہے۔ شبلی کے مقالات اور تصنیفات کی مقبولیت اور شہرت کو سید صاحب نے بڑی خوبی اور قابلیت کے ساتھ بیان کیا ہے تاہم یہ امر واقع ہے کہ شبلی کے علمی کمالات پر بحث بہت حد تک تشنہ ہے، یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں شبلی کی خوبیاں بحیثیت ایک ادیب، شاعر، ناقد اور مورخ کے بیان کی گئی ہیں لیکن یہ پیرایہ بیان موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ناکافی ہے، علم الکلام اور الکلام پر جس انداز میں تنقید کی گئی ہے، اسی طریق پر شبلی کی دوسری تصنیفات کے محاسن اور نقائص پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنے کی ضرورت تھی، شبلی کی بعض کتابیں ایسی ہیں جن کے جواب میں دوسروں نے مستقل کتابیں لکھی ہیں یا ان پر بڑی مفصل تنقیدیں شائع کی ہیں حیات شبلی میں ان چیزوں پر بحث ہونا چاہیے تھی، شبلی اردو زبان کے بلند پایہ ادیب ہیں، اس لیے ضروری تھا کہ اردو ادب میں ان کا درجہ بتایا جاتا، شعر العجم کا چوتھا

حصہ ادبی تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے، موازنۂ انیس و دبیر میں ادبی نکتوں کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، شبلی بحیثیت ناقد ایک مستقل موضوع ہونا چاہیئے تھا، شبلی نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا اسی لیے ان کا مرتبہ بحیثیت مورخ ان کے نکتہ چینیوں کی نظر میں بھی بہت بلند ہے، الفاروق ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر خود شبلی کو ناز ہے لیکن سید صاحب کو شکایت ہے کہ اس میں حضرت عمرؓ کی روحانی زندگی کو پوری طرح پیش نہیں کیا گیا، شبلی ہمہ تن شاعری کی طرف متوجہ نہیں ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کی تاریخی اور دوسری نظمیں ان کے شاعرانہ کمال کی آئینہ دار ہیں، ہندوستان میں انھوں نے نئی فارسی۔ شاعری کی بنیاد ڈالی ہو یا نہیں لیکن ان کے کمال کی یہ کیا کم دلیل ہے کہ حالی جیسا بالغ نظر ناقد ان کے فارسی اشعار میں وہی گرمی اور کیف پاتا ہے جو حافظ کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ہے، حیات شبلی میں یہ کمی محسوس ہوتی ہے کہ شبلی کے علمی کمالات پر کماحقہ بحث نہیں کی گئی اور بحیثیت ادیب شاعر، ناقد اور مورخ کے ان کارناموں پر جامعیت اور تفصیل کے ساتھ روشنی نہیں ڈالی گئی۔

حیات شبلی کی کامیابی کے اسباب شبلی کی رائے میں سیرت کی کتاب ایسی ہونی چاہیئے[۱] کہ اس سے صاحب سیرت کا پایہ اونچا نظر آئے، بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ حیات شبلی کے اوراق شبلی کی عظمت اور بزرگی کے شاہد عادل ہیں اور سید صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اپنے مرحوم استاد کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے اور راہ دو دانوں کی علمی، اور ادبی ضیافت کا خوشگوار فرض مع تمام تکلفات کے بڑی خوش اسلوبی سے سر انجام دیا ہے، کتاب کی حسن ترتیب، مصنف کا عالمانہ اسلوب بیان، شواہد و اسناد کی فراوانی، معلومات کی کثرت اور شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کتاب کے گوناگوں حسن اور سید صاحب کی کامیابی کے بہترین ضامن ہیں، اس کتاب کی کامیابی کا شاید سب سے بڑا سبب سید صاحب کی

۱۔ حیات شبلی صفحہ ۱۰۷

شاگردانہ عقیدتمندی ہے جس نے ان سے استاد کے متعلق اتنی ضخیم کتاب لکھوادی اور اس ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح بھی موجود ہے، ایک اور سبب مصنف کا علمی تبحر ہے جس کا ثبوت کتاب کے صفحات پر جابجا ملتا ہے، حیاتِ شبلی کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔

حیاتِ شبلی میں سید صاحب کا ذکر

اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سید صاحب نے اپنے سوانح نگار کے لیے معتد بہ سواد فراہم کردیا ہے چنانچہ کتاب میں جابجا وہ اپنا ذکر خاکسار یا راقم کے طور پر کرتے ہیں، ۱۹۰۱ء میں ندوۃ العلماء کے مدرسہ میں داخل ہوتے ہیں اور ۱۹۰۲ء میں پہلی مرتبہ شبلی کی زیارت کرتے ہیں، ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء، ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۰ء تک، اور اگست ۱۹۱۱ء سے مئی ۱۹۱۲ء تک الندوہ کے ایڈیٹر رہتے ہیں، ۱۹۰۶ء میں علوم قدیمہ وجدیدہ کے موازنہ پر ایک بسیط مضمون لکھ کر شائع کرتے ہیں، ۱۹۰۸ء میں جدید عربی کی تعلیم کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آتا ہے، ۱۹۱۲ء میں لغات جدیدہ پیش کرتے ہیں، اس سے پہلے دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی رسالے تیار کرچکے ہیں، صیغۂ تصحیح تاریخ اسلام کے سکریٹری چنے جاتے ہیں، نواب محسن الملک اور شبلی کی شان میں عربی قصیدے لکھتے ہیں، ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسوں پر ان کی عربی تقریروں پر ہر طرف سے احسنت و آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، جرجی زیدان کی تردید میں لکھے ہوئے رسالہ الانتقاد میں بنوامیہ کی علمی سرپرستی والا حصہ سید صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، فارسی میں سید صاحب نے صرف ایک قصیدہ لکھا ہے لیکن اسے کتاب میں شامل کرنے کے لیے یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ "اپنی کم سوادی کو رسوائے عام کرنا چاہتا ہوں"، اسی طرح اردو زبان میں اپنے استاد کی تقلید میں مسلم لیگ کے بارے میں لکھی ہوئی دو نظمیں کتاب کی زینت بڑھانے کے لیے شامل کردیتے ہیں۔ غرض اسی طرح دوسرے کئی مقامات پر سید صاحب رونق افروز ہیں۔

سید صاحب کا اسلوب بیان

سید صاحب اپنی سنجیدہ نگاری اور عالمانہ انداز بیان کے لیے مشہور ہیں، ان کی کوئی تصنیف بھی اٹھا کر ہاتھ میں لیجئے، اس میں ایک ادیب کی سحر نگاری کے بجائے ایک عالم یا محقق کا علمی انداز آپ ملاحظہ کریں گے لیکن اس بیان سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سید صاحب کے یہاں ادبی گل کاری کے نمونے مفقود ہیں، شبلی کے انداز بیان میں جو شگفتگی پائی جاتی ہے وہ ان کے نفاست پسند ذوق کی مرہون منت ہے، اسی بنا پر سر سید احمد کہا کرتے تھے کہ اگر ایک ہی موضوع پر دس آدمی بھی لکھیں تو مولوی شبلی کی تحریر نرالی ہوگی، اپنے استاد کی شگفتگی سید صاحب کے حصہ میں نہیں آئی لیکن اس کی تلافی بہت حد تک ان کے محققانہ اور عالمانہ طرز بیان نے کردی ہے۔ سیرت النبیؐ کی تیسری جلد میں جو باب سید صاحب نے "فلسفۂ قدریہ اور معجزات" پر لکھا ہے وہ ہمارے دعوی کی بین دلیل ہے، ایک زمانہ تک اخبار الہلال میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کام کرنے کی وجہ سے سید صاحب مولانا ابو الکلام آزاد کے اسلوب بیان سے بھی متاثر ہوئے، چنانچہ ان کا دعویٰ ہے کہ الہلال کے بعض مشہور مضمون ان کے قلم کا ثمرہ ہیں، اس الہلالی رنگ کا اثر مدتوں ان پر رہا بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس اثر سے وہ کلیتاً آزاد نہیں ہو سکے، مشہور جادو نگار مہدی افادی کو ایک مرتبہ سختی کے ساتھ لغت کبریٰ کے استعمال پر انھیں ٹوکنا پڑا تھا، ارض القرآن کی پہلی جلد کا آغاز عربی خطبہ سے ہوتا ہے اور اس کے بعد ابتدائی جملے الہلال کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

"اس زمین کے اکثر حصے کی مادی شوری دبے حاصلی حکمت الٰہی کا مقتضا تھی کہ سلاطین عالم کے دست حرص و ہوس سے اس ارض مقدس کی عصمت مصون رہے تاکہ خود فطرت اللہ صرف اپنے حروف و خطوط سے اس کی گل کاری کر سکے اور خدا کی فطرت کا خزانہ جو اس کھنڈر میں دفن تھا پیغمبر مذہب فطری کے وجود تک محفوظ رہے"

ان جملوں کا انداز خطیبانہ یقیناً ہے لیکن ان میں نہ شبلی کے سراپا بلاغت طرز کا کوئی نشان ہو

اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد کی پختگی اور صنعت گری کا کوئی اثر موجود ہے، ارض القرآن تو خیر ان کے عہد شباب کی تصنیف ہے اس لیے اس میں خطیبانہ رنگ کا پایا جانا کوئی بڑی بات نہیں، لیکن حیات شبلی کو لیجئے جو ارض القرآن سے تقریباً تیس سال کے بعد لکھی گئی ہے اس کے دیباچے کی چند سطریں پڑھ کر شبہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں ہمارے ہاتھ میں مولانا آزاد کی کوئی تحریر تو نہیں ہے،

"پیش نظر کتاب ایک ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے تیس برس (۱۸۸۴ء، ۱۹۱۴ء) تک ہندستان اور ہندستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پر شور رکھا

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گرداں زدہ است"

سید صاحب کی معلومات کی وسعت، دلائل کی منطقی ترتیب، قدرت بیان اور متانت و سنجیدگی نے حیات شبلی کو باغ وبہار کی طرح شگفتہ وشاداب بنا دیا ہے، ان کے بعض چھوٹے چھوٹے جملے دلآویزی اور تاثیر کے اعتبار سے بلاغت کے بڑے اچھے نمونے ہیں مثلاً مفتی عنایت احمد کے بارے میں جنھیں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد بغاوت کے الزام میں انڈمان بھیجا گیا تھا سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"مگر کیا عجیب بات ہے کہ دریائے شور کے ساحل پر بھی یہ چشمۂ شیریں اسی طرح ابلتا رہا"[1]

دارالعلوم ندوہ میں تفسیر کے کمرہ کی تعمیر میں شبلی اور ان کے ہونہار شاگردوں نے جس ذوق وشوق سے حصہ لیا سید صاحب اس کی کیفیت بیان کرتے وقت فرماتے ہیں[2]:۔

اس عمارت کی ہر اینٹ ان کی امید وآرزو کی ایک لوح تھی، اس خوش منظر قطعہ میں بجری

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۳۰۰ [2] ایضاً صفحہ ۴۹۲

ہوئی امیدوں کے ساتھ کبھی تنہا جاتے، کبھی دوسروں کو لے جاتے۔"

قسطنطنیہ میں اسلامی شوکت کے نظارہ سے جو کیفیت شبلی کے دل پر طاری ہوئی تھی اس کیفیت کی تصویر سید صاحب کے قلم نے اس طرح کھینچی ہے[۱]:-

"وہ (شبلی) خود ایک غلام ملک کے باشندے تھے اور اپنے ہم وطن مسلمانوں کی پست حوصلگی بزدلی، خودغرضی اور تملق پیشگی کے مناظر دیکھ چکے تھے، ایک آزاد سرزمین پر قدم رکھتے ہی دنیا بالکل بدلی ہوئی نظر آئی اور اپنی زبوں حالی کا احساس اور قوی ہوگیا تاہم جس اسلامی جاہ وجلال اور عظمت وجبروت کی داستانیں کتابوں میں پڑھی تھیں اس کے بچے کھچے آثار کو بچشم خود دیکھ کر روح مضطرب کو جو سرمایۂ نشاط حاصل ہوتا اور دل بیتاب سے جوش سرور کی جو موجیں اٹھتیں اس کا اظہار لفظوں کی قدرت سے باہر ہے، ہر جمعہ کو رسم سلاملق کا دلفروز سماں اور عید کے موقع پر موکب سلطانی کا پرشکوہ منظر اس درجہ روح پرور تھا کہ مولانا پر تھوڑی دیر کے لیے ایک بیخودی سی چھا جاتی، مولانا نے ایک مختصر سی مثنوی میں موکب سلطانی کے دل کش نظارے کی مصوری کی ہے جس کا ہر لفظ خوشی ومسرت کا چھلکتا ساغر ہے، اپنے کیف ووارفتگی کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے:-

خواب خوشی دیدم و دیگر مپرس بگذر ازین حرف و مکرر مپرس

دیدۂ من بازو بخوابم ہنوز تندیٔ بوے خمرابم ہنوز"

شبلی کی طرح سید صاحب کے یہاں بھی طنز اور تعریض موجود ہے اور بعض مواقع پر ان کا قلم تیر ونشتر کا کام دیتا ہے، جن حضرات نے ان کے شذرات پڑھے ہیں ان کے ملاحظہ سے طنز کی کئی مثالیں گزری ہوں گی، جب عنایت اللہ خاں مشرقی کی کتاب تذکرہ شائع ہوئی تو اس کے خلاف کئی مضامین لکھے گئے لیکن جس چیز نے مشرقی صاحب کو سب سے زیادہ مضطرب کیا شاید وہ سید صاحب

---

[۱] حیات شبلی صفحہ ۲۰۵

کے شذرات تھے، حیات شبلی میں بھی طنز کی بعض اچھی مثالیں موجود ہیں، سید صاحب کا قیاس ہے کہ شبلی مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے حلقۂ تلامذہ میں اس لیے شریک نہیں ہو سکے کہ مولانا عبدالحی میں نقد و اجتہاد کی کمی تھی۔ اس مطلب کو سید صاحب اس طرح ادا کرتے ہیں[1]۔

"علامہ مرحوم کچھ تو فطری جودت طبع اور کچھ فیض فاروقی کی بدولت نقد و اجتہاد کے خوگر تھے اور جہاں جاتے ان کی نظر پہلے اسی جوہر کی تلاش کرتی، اس لیے زانوئے ادب تہہ کرنے سے پہلے ہی لکھنؤ سے قدم اٹھ گئے"۔

سید صاحب کے بیان کے مطابق شبلی نے سرسید کے مجبور کرنے پر رسالہ تہذیب الاخلاق کے لیے المعتزلہ والاعتزال کے نام سے ایک تاریخی مضمون شروع کیا جو یکم محرم ۱۳۱۳ھ (مطابق جولائی ۱۸۹۵ء) کے پرچہ میں چھپا اور اس کو بھی ناتمام چھوڑ دیا، بعد میں اس ناتمام مضمون کو مولوی وحید الدین سلیم نے تمام کیا لیکن یہ مضمون سید صاحب کی رائے میں کچھ اچھا نہ تھا، اس ناپسندیدگی کا اظہار ملاحظہ ہو[2]۔

"جس کو مولوی وحید الدین سلیم نے ۱۳ شوال ۱۳۱۴ ہجری کے پرچہ میں مشاہیر معتزلہ کے عنوان سے جس طرح ان سے بنا پورا کیا"۔

مولوی اسلم جیراج پوری کی تاریخ الامامت کو سید صاحب ایک عربی کتاب کا ترجمہ بتاتے ہیں[3]۔

"آخر اس (جرجی زیدان) کے بجائے شیخ محمد خضری مقرر ہوئے جن کے تاریخی لیکچر چھپ چکے ہیں اور اردو میں تاریخ الامامت کے نام سے روشناس ہیں"۔

سید صاحب کی تحریر میں محض عربی الفاظ کا عنصر ہی نہیں پایا جاتا بلکہ عربی گرامر کی پابندی تک ملتی ہے مثلاً فرق باطلہ، سنت سنیہ، حیات مبارکہ، باقیات صالحات کا موں، خاتمۂ دوران جدید

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۷۹ [2] ایضاً صفحہ ۳۸۷ [3] ایضاً صفحہ ۵۷۸

ماجدہ، شوق افاضہ، استشارہ احقاق حق وازہاق باطل وغیرہ، ایک جگہ انگریزی لفظ کریڈٹ بھی استعمال کیا گیا ہے چنانچہ سید صاحب فرماتے ہیں[1]:-

"اس لیے اس اخبار کی پسندیدگی کا سارا کریڈٹ مولانا کے حصے میں آتا رہا"

حیات شبلی آٹھ سو صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہے اس کے باوجود اس کے ساتھ نہ غلط نامہ شامل کیا گیا ہے اور نہ انڈکس،

شبلی کی تجہیز و تکفین کا ذکر کرنے کے بعد سید صاحب اس موثر انداز میں اپنے استاد کو خطاب کرتے ہیں[2]:-

اُستاد بزرگوار جا جا در سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھ کو بہت ڈھونڈھے گی لیکن نہ پائے گی، لیکن تیرے علمی فیوض و برکات کا منظر ہمیشہ نظر آتا رہے گا،

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست"

اس بیان کی تصدیق وہ ہزاروں دل کریں گے جن پر آج بھی شبلی حکمرانی کر رہے ہیں۔

---

[1] حیات شبلی صفحہ ۶۱۱ [2] ایضاً صفحہ ۷۴۳ و ۷۴۴

حسرت موہانی و سائل دہلوی

(ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ)

سید فضل الحسن حسرت موہانی کی ذات و کمالات پر لوگوں کے لکھنے سے میری تسلی نہیں ہوئی نہ ہوگی۔ افسوس کہ اس ذوق کو کوئی آزاد نہ ملا اور اس غالب کو کوئی حالی نصیب نہ ہوا مگر اس کی شکایت بے جا سی ہے اس لیے کہ حسرت کہتے ہیں، ع

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

کئی اشعار میں حسرت نے اپنی ذات کی عظمت اور اپنے کمال کے اوج کی طرف لطیف پیرایہ میں اشارے کیے ہیں گویا سمجھنے والوں پر اپنی شخصیت کے بند دروازوں کو وا کر دیا ہے۔ ادیب اپنا بہترین نقاد بھی ہوتا ہے کہ وہ اُن گنے چنے افراد سے ہوتا ہے جنھیں اپنی رسائی کی تمام و کمال خبر رہتی ہے، ورنہ انسانی آبادی کا بیشتر حصہ ظاہر سے ہر چند باخبر ہو اپنے باطن کے معاملہ میں فریب کھاتا اور فریب کھلاتا رہتا ہے۔ دیوانہ ؎

زندگی اک فریب ہے، زندگی ہے فریب سے — جھوٹی قسم کا آپ کی، دل نہ فریب کھائے کیوں

انسان کے لیے انسانیت پہلی شرط ہے، انسانیت سے مراد ہے لطافتِ احساس۔ اگر اظہار جذبات و احساسات پر بھی قابو ہو یعنی انسان ادیب بھی ہو تو بہت اچھا۔ حسرت انسانیت کا پتلا ہیں اور ادب کے دیوانے۔ جو کام کیا سیاست کے میدان میں یا ادب کے کوہساروں میں یا محبت کے ریگزار میں اسے جنون کی حد تک پہونچا کر دم لیا اور شرافت کو کہ عام گیسہ

مروّت کا دوسرا نام ہے، کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ میں نے انھیں دوسروں کے عیب شاذ و نادر ہی بیان کرتے سنا اور جب کبھی کسی کی خامیاں گنائیں گویا اس میں کچھ برتا اور اس انداز سے کہا کہ محض لغزش و زود گزاشت ہے گناہ نہیں عیب نہیں۔

شرافت اور انسانیت کی آخری حد یہ ہے کہ نہ انسان کے سامنے نہ خداوند دو عالم کے حضور میں شکوہ کی گستاخی کرے۔ خود غم کھائے مگر کسی کو رنج نہ دے۔ اگر ہماری کوئی تمنّا کسی کو ناگوار ہو تو اپنی حسرت کا خون کر لینا دوسرے کا خون بہانے سے افضل و اولیٰ ہوگا۔ دیوانہ ؎

یہ سوچ کر کہ ہو نہ کسی کو وہ، ناگوار		اللہ ہم نے اپنی تمنّا کا خون کیا

حسرت میدانِ سیاست کے مرد ہیں مگر نہ کسی کو حریف سمجھا نہ کسی پر چوٹ کی۔ تذکرۃ الشعراء چھپوایا مگر آہو گیری سے تنسب و نظر کو آلودہ نہیں کیا۔ اچھی چیز جہاں دیکھی زیبِ اوراق کر لی۔ مجھے تو اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دربار کیا اور انسانِ ہیچ کے ہیچ تر گناہوں کی پڑتال کیا۔ وہاں تو ہم لوگ باری باری پیش ہوں گے اور یہ حکم سنا کر بھجوا دیے جائیں گے، "اسے بھی بخشا" "اسے بھی معاف کیا"۔ دیوانہ ؎

ہیچ آدمی ہے اس کے ثواب و گناہ ہیچ		خود کو سمجھتا ہی نہیں یہ غافل آہ! ہیچ

مائل دہلوی کا شعر بھی خوب ہے ؎

جب سے سنا ہے غلغلہ عفو الٰہ کا		ہے عرش پر دماغ ہمارے گناہ کا

ثواب و گناہ سے متعلق حسرت کے دو شعر سب سے پہلے لیجیے۔ اس بندۂ خدا نے اپنے بے نیاز مالک کو حساب کتاب سے کیسے بالا کر دکھایا ہے اور گرفتارِ نیک و بد پر کیسی چوٹ کی ہے ؎

زاہد کسے ہے عاقبتِ کار کی خبر		حسنِ عمل پہ دیکھ بھروسہ نہ کر عبث

بڑا گناہ کیا ترک ِ مئے سے شک میں پڑے　　یقینِ رحمتِ آمرزگار ہم کرتے

نہ جانے اللہ تعالیٰ کے ہاں جانچ کی کون سی تکڑی اور پرکھ کی کون سی کسوٹی ہے۔ ہم ناحق نیک و بد کے معیار قائم کر کے ایک دوسرے کو متہم و مردود قرار دے رہے ہیں۔ اور پھر رحمت پر یقین نہ کرنا تو سب سے بڑا گناہ ہے، مے کشی گناہ ہو نہ ہو پہلے شعر کا مضمون میں نے اڑا لیا۔ دیوانہ

اے زاہد ایک چیز ہے حسنِ عمل مگر　　ہے کس کو یہ خبر کہ خدا چاہتا ہے کیا

دوسرا بڑا گناہ ہے وطن کی جنگِ حریت میں شامل نہ ہونا۔ غلام ہندوستان کی فضا حسرت کو کیسے راس آتی۔ جیل کی ہوا کھانے کئی مرتبہ گئے اور وہ ماحول توسنِ طبع پر تازیانہ کا کام کر گیا۔

اس بارے میں حسرت اور جوہر (مولانا محمد علی) ایک کان کے گوہر ہیں۔ حسرت ؎

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کی طبیعت واقعی اک طرفہ تماشا ہے۔ طرزِ زندگی سادہ مگر طبیعت رنگین۔ بیوار میں بے نیازی، مگر اصول کے معاملہ میں سخت ترین پابندی۔ بس زبان سے شہد سے شیریں کلام فرماتے ہیں اسی زبان سے بے اصولی پر تلخ تر تنقید کر ڈالتے ہیں اور نعرۂ جنگ نکالتے ہیں۔ اپنے نفس پر ہر طرح کے ضبط سے ظلم کرتے ہیں مگر دوسروں کے لیے ہر مناسب رعایت و لحاظ پیشِ نظر ہے۔ عمر سیاست میں گزاری، مگر دیوان محبت ہی کی نذر کیا ؎

حسرت جو کار و بارِ محبت یہی رہا　　سن لوگے ہم بھی صاحبِ دیوان ہو گئے

حسرت کو تسلیم کی شاگردی پر ناز ہے، مگر سچ تو یہ ہے کہ حسرت کی نگاہِ انتخاب نے تسلیم کو چمکا دیا ہے۔ سارا دیوان دیکھو تو طبیعت بے مزہ ہو جائے۔ حسرت کا منتخب دیوانِ تسلیم دیکھو تو سجدے کو جی چاہے۔

محبت کو حسرت نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے۔ ان کی محبت اشراف کی محبت

ہے۔ ان کے مجاز پر حقیقت انگلی اٹھانے کی مجاز نہیں۔ ان کی محبت نے نہ ان کا ایمان کھویا نہ انھیں ہجر کی بے پناہ اذیتیں دیں اس لئے کہ ان کا ایمان محبت سے پختہ ہوا اور ہجر کو یہ قوتِ تصور سے وصال میں بدلتے رہے ؎

شوقِ وصالِ یار کے قابل بنا دیا دل کیا تھا عاشقی نے اسے دِل بنا دیا

ع — ہم اگر چاہیں تو زندان کو گلستاں کر لیں

حسن کو حق کا مترادف کر کے دکھا دیا۔ عشق کے ساتھ ساتھ کارِ تصوف کا بھی خوب نباہ ہوتا رہا۔ عشقِ رسول میں اور کرشن بھگتی میں کوئی فرق نہ دیکھا نہ روا رکھا۔ پیروں کے مزاروں کی زیارت کی اور برج بھومی کی خاک بھی چھانی۔ خوشی سے خوش نہ ہوئے اور دکھ انھیں دکھی نہ کر سکا۔ عرصہ ہوا حسرت اور رموزِ اسرارِ تصوف کے نام سے میں نے ایک مضمون لکھ کر شائع کروایا تھا۔ اس وقت سے حسرت اور محبت کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

جذب کامل کو اثر اپنا دکھا دینا تھا میرے پہلو میں انھیں لا کے بٹھا دینا تھا

کچھ تو دینا تھا ہمیں تیرے تغافل کا جواب یا خدا اُن کے تجھے دل سے بھلا دینا تھا

دیکھا آپ نے۔ محبت جذب کامل کے بغیر تکمیل نہیں پا سکتی اور اکثر بتوں کا شیوہ تغافل مسلسل رہے تو وہ انسان کو باخدا بنا دیتا ہے۔ اگر ایسا باخدا انسان محبت پر پھر مائل ہو تو کامرانی اس کے قدم لے اور محبوب صدقے اور نثار ہو۔ حسرت ایسے لوگ ناکامی جانتے ہی نہیں ؎

میں ہوں وہ رِند جو کہ طبیعت میری حسرت ناکامئ جاوید سے بھی شاد رہے گی

جذب کامل انھیں محبوب کے ہم پہلو رکھتا ہے، جذبِ کامل نہیں تو کمالِ تصور سے استفادہ کرتے ہیں فقیر کا شعر ہے۔ دیوانہ ؎

تم عالمِ خیال میں ہو اپنے سامنے ہم فرق جانتے نہیں ہجر و وصال کا

عشق کا سلسلہ دین سے کیونکر ملایا ہے۔ دیکھئے ؎

مذہبِ عشق میں گنجائشِ تاویل کہاں   دین پر حیف ہے گر دین کا منشا ہے یہی

عشق کی تمنا ہی حاصلِ عشق ہے ؎

راضی ہیں بنے یا نہ بنے کام ہمارا   ہم لوگ ہیں سرگشتہ و حیرانِ تمنا

ہاں مگر یہ تمنا عشق کی ہوس کے شائبہ تک سے پاک ؎

رسوائی ا[illegible]ے بے دل نہیں ہوتے   ہم ہیں وہ جہاں دیدہ گدایانِ تمنا

دیکھئے حاصل کس شان سے باندھا ہے ؎

بیت الغزلِ حسن کچھ ایسے ہیں وہ ابرو   ہے جن کی ہوس حاصلِ دیوانِ تمنا

حسرت کی غزل حاصلِ دیوانِ تمنا ہے ؎

عالی ہے بہت مرتبۂ عشق حقیقی !   مایوس نہ ہوں حوصلہ مندانِ تمنا

غزل میں اور خاص کر بیانِ تمنا میں مجھے تو سوائے مائل شاگردِ تسلیم نارنولی کے اور کوئی حسرت کا ہم پایہ نظر نہ آیا۔ حسرت کانپوری اور مائل دہلوی۔ مائل کا پلہ کبھی کبھی بھاری رہتا ہے ان کی دہلویت کے طفیل۔ یہ ظالم دل والے جہاں خیال اور زبان کو ہم کر لیتے ہیں ستم ہی توڑ ڈھاتے ہیں۔ ہر چند حسرت نے دہلی اور لکھنؤ کی خوبیاں یک جا کرنے کی سعی کامیاب کی ہے۔ دِلّی کا مایۂ ناز مائل (مرزا محمد تقی بیگ) ان سے کئی اشعار میں بازی لے گیا ہے۔ مائل ؎

کیا جانئے کیا چیز ہے یہ عشق کا غم بھی   دیکھا جسے روتے ہوئے رونے لگے ہم بھی

امید کرم پر تری یاں تک تو ہیں گستاخ   جھوٹی کبھی کھا لیتے ہیں ہم تیری قسم بھی

بُت خانے میں رہتے ہوئے مدت ہوئی مائل   جی میں ہے کہ دیکھ آئیں کسی روز حرم بھی

اور یہ کہیں حسرت کی جس چوٹ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے کہ زاہد کو حسنِ عمل پر بھروسہ

عبث نہ کرنا چاہیئے اس سے کہیں بڑھ کر ضرب مائل نے ہلکے ہاتھ سے لگا کر دکھا دی ہے ؎

یاد اس کی تو نہ ڈال رسوم و قیود میں — اے شیخ کیا دھرا ہے رکوع و سجود میں

رکوع و سجود پر اپنا ایک شعر یاد آیا۔ دیوانہ نے ؎

اے شیخ بار بار رکوع و سجود کیا — اک بار جھک گئی تو جھکی ہی جبیں رہے

اور اس شعر کا تو نہ غالب کے پاس جواب ہے نہ میر کے پاس نہ سودا کے پاس ہاں، نہ درد کے تکیہ میں ؎

مجھ کو تو زندگی سے جبھی یاس ہو گئی — اس نے دیا جو رنگ عدم کا وجود میں

حسرت اور مائل عشق و تصوف، تصویر اور اصل کو اپنی اپنی جا رکھنے میں ہم مرتبہ ہیں ؎

مانا کہ دل کشی ہے مگر محو اس قدر — مائل خدا کے واسطے تصویر میں نہ ہو

اور وہ جو میں نے انسان کے ہیچ ہونے اور اللہ سے حساب و کتاب منسوب نہ کرنے کی باتیں کہی ہیں ذرا انصاف کرنا کیا میں نے غلط کہا؟ اہلِ زبان اور اہلِ دل کی سند پیش کرتا ہوں مائل سے ؎

باتیں ہیں واعظوں کی، عذاب و ثواب کیا — دو دن کی زندگی میں حساب و کتاب کیا

مائل نے جہاں لکھنؤ کا رنگ اختیار کیا ہے ایسے شعر نکالے ہیں جو حسرت سے منسوب کر دیے جائیں تو حسرت کو بھی انکار نہ ہو ؎

ستم آمیز نہ ہوتی جو کسی کی غفلت — تو خموشی میں مرے رنگِ فغاں کیوں ہوتا

دعوےٰ عشق ہوس پیشہ جو چاہیں سو کریں — کچھ بھی ہوتا تو یہ اندازِ بیاں کیوں ہوتا

مائل کی ردیف کے تیور بانکی غالب کی ردیف "بیاں کیوں ہو گئے ہیں"۔ کیا مقطع نکالا ہے!!! سبحان اللہ اس کے عوض نہیں عمرِ خضر ملتی تو انصاف تھا۔ مگر ایسوں کو عمرِ خضر راس

نہیں آتی ؎

مائل آغازِ جوانی ہی میں دنیا سے اٹھا
تھی طبیعت ہی بلا کی وہ جواں کیوں ہوتا

حسرت کا ایک شعر شراب کا اکثر یاد آتا ہے ؎

جس کی رنگینیوں پر سینکڑوں جلوے ہیں نثار
ہائے کیا چیز وہ شیشے میں دھری رکھی ہے

شیشے کو دیکھ کر حسرت نے کیا دیکھا اور اس پر کیا گزری! مائل کم نہیں۔ ان پر جو گذری اسے سب نے دیکھا اور ایک صاحب سے تو رہا نہ گیا۔ کہنے لگے ؎

گر اسی کا نام ہے تقویٰ تو بس مائل سلام
جو ہوئی حالت تمھاری جامِ صہبا دیکھ کر

• عمدہ عمدہ ترکیبیں اساتذہ سے لے لینے یا خود تراشنے کا ملکہ اور انھیں اسلوب سے نگینے کی طرح بٹھانے میں مہارت مومن سے تسلیم اور تسلیم سے حسرت موہانی میں خوب آئی ہے۔ اگر ترکیب بڑی ہو تو باقی الفاظ چھوٹے چھوٹے پیارے پیارے ہوں، یہی کامیابی کا راز ہے۔ موسیقیت اور معنویت ہر دو کے اعتبار سے حسرت کا انتخاب الفاظ لاجواب ہوتا ہے۔

مائل کی چند ترکیبیں سنیئے ؎

توبہ بھی ان دنوں میں تو نا سود مند ہے
ماہِ صیام ہے، درِ مے خانہ بند ہے

مائل تجھے ہے ولولۂ صبر و تحمل
اچھا ہے کہ پاسِ دلِ شیدا نہ کریں وہ

کوثر پہ نظر آئے جو مے خانہ نشیں لوگ
واعظ نہ گیا مجمع رندانہ سمجھ کر

سن سن کے تری وسعتِ رحمت کو بڑھا دل
دیکھوں تو کہے خلق گنہ گار کہاں تک

سخن بھی دریاں آنے نہ دیتے لن ترانی کا
جو ہوتا یاد ڈھب موسیٰ کو تقریرِ زبانی کا

ع۔ کہتے ہیں کہ سر حلقہ خدامِ حرم تھا

حسرت کی ایک آدھ ترکیب بھی دیکھئے ؎

بے مثالی کا ہو یہ رنگ جو باوصفِ حجاب ۔۔۔ بے نقابی پہ ترا جلوۂ یکتا کیا ہو

ہزار عشق تری چشم نیم وا پہ نثار ۔۔۔ نہ ڈال مجھ پہ یہ افسونِ خواب رہنے دے

اب دل ہے نہ وہ عیشِ فراوانِ تمنّا ۔۔۔ سب لوٹ لیا یاس نے سامانِ تمنّا

آخر میں میں حسرت کے متعلق کچھ نہیں کہتا اس لیے کہ میں جو تین برس کان پور رہا انھیں استاد سمجھتا تھا اور خود کو ہیچ میرز شاگرد۔ کبھی کبھی اصلاح لیتا تھا۔ وہ سلسلہ ترک کان پور کے ساتھ ۱۹۲۳ء میں ختم ہو گیا مگر میری عقیدت کا حال اب تک وہی ہے۔ البتہ حسرت کا قول مائل کے بارے میں نقل کرتا ہوں:۔

"ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت سخنورانِ دہلی میں مرزا مائل سے بہتر کہنے والا اور کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ آپ کے رندانہ اشعار خصوصاً مقطع بے مثل ہوتے ہیں"۔

ثبوت میں جو شعر حسرت نے مائل کے دیے ہیں ان میں یہ دو بھی ہیں:۔

عظمتِ کعبہ مسلّم ہے مگر بت کدے میں ۔۔۔ ایک آرام یہ کیسا ہے کہ کچھ دور نہیں

میں پہونچ جاتا کسی دن کعبہ تک ۔۔۔ لیکن آدھی راہ پر بت خانہ تھا

فقیر نے بھی لکھا ہے۔ دیوانہ ؎

مائل نہیں ہوتی تو دعا میں نہیں ہوتی تاثیر ۔۔۔ اور جو ہوتا ہے تو باتوں میں اثر ہوتا ہے

گجرات میں مذہبی مثنویاں

(از سید ظہیر الدین مدنی)

تمام اصناف سخن میں مثنوی ایک ایسی جامع اور اہم صنف ہے کہ اگر کسی زبان میں صرف یہی ایک صنف شاعری موجود ہو تو بھی دوسری زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں اس صنف واحد کی شاعری کسی طرح کم پایہ ثابت نہ ہوگی۔ مثنوی داخلی اور خارجی شاعری کا مجموعہ ہے۔ اس کی جامعیت کی وجہ سے اکثر و بیشتر متمدن و غیر متمدن ملکوں کی زبانوں میں اسی صنف سخن کو شاعروں، صوفیوں اور رہنماؤں نے اپنی جودت طبع کے لیے جولانگہ تجویز کیا۔ ایک فلسفی حیات و کائنات کے اہم مسائل اور باریک نکتوں کی تشریح و توضیح کے لیے اسی صنف کو ترجیح دیتا ہے۔ رخش خیال صناع اپنی قابلیتوں کے اظہار کے لیے اسی میدان کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ ایک حقیقت نگار عالم اعلیٰ و اسفل کی حقیقتوں تک پہونچنے کے لیے مثنوی ہی کو آلۂ کار بناتا ہے۔ اور ایک مفکر تجسس فکر اور تسلسل خیال کے دھارے کو جاری و ساری رکھنے کے لیے مثنوی کا ہی سہارا لیتا ہے۔

معنوی اعتبار سے اگر مثنوی ایک طرف ڈرامہ کا نعم البدل ہے تو دوسری طرف تاریخی حیثیت سے قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ ہے۔ اگر صناعی کے اعتبار سے یہ نقشہائے رنگ رنگ ہے تو سماج اور افراد کی اصلاح کے اعتبار سے یہ مبلغ مذہب اور معلم اخلاق کا درجہ رکھتی ہے بالغرض مثنوی کی ہمہ گیری کا راز ان ہی گوناگوں خصوصیات میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی ہر خیال کی حامل ہو سکتی ہے۔

مثنوی کا نام آتے ہی فوراً ہمارا ذہن فارسی ادب کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لیے رزم و بزم کی سیر کرنے کے بعد جب ہم فردوسی و نظامی ایسے استادان عالم کے خوشہ چینوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے مقابلہ میں اردو ادب کے استادانِ فن اور خدایانِ سخن ابجد خواں نظر آتے ہیں، اور ہمیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اردو مثنوی کو خاطر خواہ فروغ نصیب نہیں ہوا، مگر یہ نظریۂ اضافیت کی فریب کاری ہے ورنہ غواصی، ابن نشاطی، میر حسن، نسیم، شوق وغیرہ کے نام بھی مثنوی کے سلسلہ میں ہمیشہ ادب و احترام کے ساتھ لیے جائیں گے، لہٰذا اردو کے مثنوی نگاروں کے کارناموں کا مطالعہ لطف سے خالی نہیں بلکہ اس دشت میں جادہ پیمائی کرنے والوں کے لیے ان فن کاروں کے کارنامے چراغِ راہ ثابت ہوں گے۔ اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو قصہ گوئی اور اردو ڈرامہ کے ایک طالب علم کے لیے اردو مثنوی کا مطالعہ ناگزیر ہے اسی طرح جب تک مذہبی و اخلاقی مثنویوں کو بھی بہ نظر امعان نہ دیکھا جائے اردو مثنوی کا مطالعہ نامکمل رہے گا۔

مثنوی پروپیگنڈے کے نقطۂ نظر سے بہت اہم صنف ثابت ہوئی ہے۔ دنیا میں تبلیغ مذہب، تعلیم کی اشاعت، اور اخلاق آموزی کے لیے اگر کوئی بہترین طریقہ نظر آتا ہے تو وہ ڈرامہ ہے، اس سے خاص و عام دونوں برابر کا فیض اٹھا سکتے ہیں۔ جہاں کان سے سنتے ہیں وہاں آنکھوں دیکھی بات بھی ہوتی ہے، دوسرے ان پڑھ عوام کے لیے تو اس طریقہ سے بہتر کوئی اور طریقہ ہو ہی نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ آج بھی تعلیم قدرے عام ہونے کے باوجود ڈرامہ سے مذہبی اور اخلاقی پروپیگنڈے کا کام برابر لیا جاتا ہے۔ جس زمانہ میں مذہب کا دور دورہ تھا اور اہل کلیسا کا سکہ چلتا تھا اس زمانے میں بھی مذہب کی اشاعت کے لیے ڈرامہ ہی کو آلۂ کار بنایا گیا تھا، بارھویں صدی عیسوی میں تو یورپ کے کلیساؤں میں ڈرامے

پھیلے جاتے تھے۔ ہندوستان میں بھی بدھوں نے بدھ مت پھیلانے کے لیے ڈرامہ ہی کو اختیار کیا تھا، اور ان کے بعد برہمنوں کو بھی اس کام کے لیے یہی طریقہ اختیار کرنا پڑا، اگر مسلمانوں میں ڈرامہ کو مخرب اخلاق یا مذہب کی رو سے ممنوع قرار نہ دیا جاتا تو شاید مسلمان بھی مثنوی سے پہلے ڈرامہ ہی کو آلۂ اظہار خیال بناتے مگر ڈرامہ کے بعد ایران اور ہندستان میں اس کام کے لیے مثنوی ہی کو دیگر تمام اصناف سے زیادہ موزوں اور مناسب خیال کر کے مبلغین اسلام نے اختیار کیا۔

فارسی کے عروج کے ابتدائی ادوار میں ایک طرف خدا ترس لوگوں نے اپنے عہد کو دور بے دینی و الحاد سمجھ کر مذہب کی جڑیں کھوکھلی ہو جانے سے بچانے کی غرض سے شعر و سخن میں مذہب و اخلاق کو داخل کر دیا سعدی کا کلام اس بات کا غماز ہے، دوسری طرف خدا رسیدہ لوگوں نے شعر و شاعری میں تصوف کی چاشنی ملانا شروع کر دیا اور حافظ کے بعد سے تصوف غزل کی ایک اہم خصوصیت قرار پائی، غرض جیسے جیسے اخلاقی پستی بڑھتی گئی ادب میں مذہبی رجحان بھی بڑھتا گیا، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانہ میں علم و ادب ایک مخصوص طبقہ کی میراث سمجھا جاتا تھا، اور اخلاقی پستی کا ذمہ دار صرف یہی طبقہ نہیں تھا، لیکن یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ عوام میں نسبتاً مذہب زندہ رہتا ہے اور عوام کو تلقین کرنے کے لیے واعظ خشک کے چند چلتے ہوئے فقرے بھی کافی ہوتے ہیں غرض فارسی ادب میں بہت پہلے سے مذہبی رجحان شعر و شاعری میں شامل ہو چکا تھا، اور آہستہ آہستہ یہی چیز شعر و سخن کا ایک جزو قرار پا گئی اور فارسی ادب کی دوسری تمام خصوصیات کے ساتھ یہ خصوصیت بھی اردو زبان کی شاعری میں چلی آئی۔

صوفیائے کرام نے جب اردو ادب کی تشکیل کی تو تبلیغ اسلام جس کے لیے پاک باطن

و پاک طینت اپنے وطنوں کو خیر باد کہہ کر اس خاک دانِ ہند میں وارد ہوئے تھے اس مقصد کی برآری کے لیے اس گروہ نے صنفِ مثنوی کو ذریعہ تجویز کیا۔

مذہبی مثنویوں کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں ساتویں صدی ہجری تک پیچھے جانا ہوگا۔ بابا فرید گنج شکر متوفی ۶۶۴ھ سے ایک مختصر مثنوی منسوب ہے جو اپنی لسانی خصوصیات کی وجہ سے زمانۂ بعد کی خیال کی جاتی ہے لیکن اگر یہ واقعی بابا گنج شکر کی مثنوی تسلیم کی جائے تو اسے اردو کی پہلی مذہبی مثنوی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے بزرگ امیر خسرو (۶۳۴ھ تا ۷۲۰ھ) ہیں۔ جن کی پہیلیاں اور مکرنیاں بھی مثنوی کی ترکیب پر ہیں، اسی دور میں بابا کبیر کی لکھی ایک نظم مثنوی کے ڈھنگ پر پائی جاتی ہے۔ دسویں صدی کے اوائل کے ایک شاعر قطبن نے ملک محمد جائسی کے طرز پر ایک مثنوی مرگاوتی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی (۸۶۰ھ تا ۹۴۹ھ) کی لکھی چند نظمیں مثنوی کے طرز پر ملتی ہیں۔ شیخ بہاء الدین برناوی کے متعلق جناب عبد القادر سروری کا خیال ہے کہ "مثنوی کے قافیہ کی ترتیب میں کچھ نظمیں لکھی ہوں لیکن فی الحال ان کے نمونے ہماری دست رس میں نہیں ہیں[1]"۔ اسی طرح مثنوی کے ارتقاء کے اوائلی دور میں دکن میں بھی شمس العشاق شاہ میراں جی متوفی ۹۰۲ھ کا کافی کلام پایا جاتا ہے۔ مذکورۂ بالا تمام صوفیائے کرام کے سوانحِ حیات اور کلام کا نمونہ شیرانی مرحوم اور عبد الحق صاحب نے اپنی تصانیف "پنجاب میں اردو" اور "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں دیا ہے۔ ان صوفیائے کرام نے اردو ادب میں پہلے پہل مذہبی مثنوی کا ڈول ڈالا اور یہ مثنوی کا پہلا دور قرار پایا۔

اب ہم گجرات کے مثنوی نگاروں کا ذرا تفصیل سے ذکر کریں گے۔

گجرات کی مسلم سلطنت میں چند صوفیائے کرام کے نام ملتے ہیں جنھوں نے تبلیغ اسلام اور اپنے مریدانِ باصفا کی ہدایت کے لیے جب اردو زبان کو اختیار کیا تو پہلے پہل مثنوی ہی کے

[1] اردو مثنوی کا ارتقاء

ڈھنگ پر نظمیں لکھنا شروع کیا، ہیں سب سے پہلے حضرت شیخ بہاء الدین باجن کا نام لتا ہے جن کی عمر کا بیشتر حصّہ گجرات میں گزرا ہے اور آخری وقت میں آپ نے بمقام برہان پور سکونت اختیار کی، اسی جگہ سنہ ۹۱۲ھ میں وفات پائی آپ نے ایک سو بائیس سال کی عمر پائی تھی، حضرت باجن نے اپنے پیر و مرشد کی صفت میں ایک رسالہ "خزینہ رحمت" یادگار چھوڑا ہے اس میں چند نظمیں مثنوی کے طرز پر پائی جاتی ہیں کلام کا رنگ متصوفانہ ہے۔

نمونۂ کلام

یہ نتنی کیا کسے یہ ملتی ہے　　جب ملتی ہے تب پہلتی ہے
بیت دوم۔ آن بہت گھیرے پارے　　بجے اس بگے وے انہ چھارے
بجے رہے اس تہے تارے　　دے نجانے اس تہے پاسے
بجے اس کارن تپنہ ترسنہ　　بجے چکہ لے تو اس سنہ بلسنہ
یہ نتنی انہوں تپا دے　　چکہ پاس انہوں نا دے
بجے اس کدھی نہ لوریں　　بجے چکہ لے تو بھی ایسی چھور نہ (ین)
تخلص۔ دیکہ باجن یہ تو جھوٹی　　کہ میٹھی چیت نیٹھی
یہ رہے ایسی دھیتی　　یہ کیا کسے یہ ملتی ہے (۱)

گجرات کے دوسرے بزرگ شاہ علی جیو گامدھنی ہیں آپ سید احمد کبیر کی اولاد میں سے ہیں، آپ بڑی شہرت کے مالک تھے، اور اسی وجہ سے گامدھنی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بمقام احمد آباد بعمر ۷ سال سنہ ۹۷۳ھ میں انتقال کیا، آپ کے کلام کا مجموعہ "جواہر اسرار اللہ" بہت مشہور و معروف ہے، مذکورہ کلام دو مرتبہ دو مختلف حضرات نے مرتب کر کے شائع کیا

نوٹ۔ (۱) از اورینٹل کالج میگزین نومبر سنہ ۱۹۳۲ء مضمون از پروفیسر محمود شیرانی

ہے، کلام عشق و معرفت کے رنگ میں ہے، مصنف "مراۃ احمدی" نے اسے شیخ مغربی کے دیوان کے ہم پلہ بتایا ہے، وحدت الوجود کے نکتوں کو واضح مثالیں دے کر سمجھایا ہے، کچھ کلام مکاشفوں کے طرز پہ ہے، کلام میں مثنوی کی بحر اور قافیہ کا التزام ہے۔

نمونۂ کلام

نکتۂ اول۔ اونچی پیپل لانبی ڈور ہم دکھلائے سو کاڈھے چور

نکتۂ دوم۔ آپ ہی آپ ہتو کا دیتا پرگٹ ہو جگ کیری کیت

ہوں تجہ بوجھوں میری ساتھے کہہ کس آگہی یہ توں باتے

نکتۂ سوم۔ پر ہوں کیسری آنکھ مچانی تن منہ کھل کر گئی سمانی

جب او نہ پہوکر چہل کہلاڑی اوجت آوکر سادہ کیاری

نکتۂ چہارم۔ گلی گلی کیتی ہہیری پن ٹوہیا توں میں میری

ہہیں علی جیو میری باہناں پرگٹ ہو جب کہیا ناہاں (۱)

مثنوی کے سلسلہ میں گجرات کے ایک اور بزرگ خوب محمد چشتی کا نام بھی نہیں بھول سکتے۔ خوب صاحب کے حالات سے ہم بالکل بے خبر ہیں آپ کا انتقال سنہ ۱۰۲۳ھ میں بمقام احمد آباد ہوا، آپ کئی تصانیف کے مالک ہیں، آپ کی ایک تصنیف "خوب ترنگ" تصوف اور لسانی اعتبار سے بہت اہم ہے، خوب ترنگ میں تصوف کے مسائل انوکھی تشبیہات اور حکایات کے پردے میں بڑی خوش اسلوبی سے واضح کیے ہیں، آپ اپنے دور کے بہت اچھے شاعر گزرے ہیں تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ نے عروض پر "چھند چھنداں" نامی رسالہ تصنیف کیا ہے (۲) اور صنائع بدائع پر بھاؤ بھید نامی رسالہ یادگار چھوڑا ہے (۳)، خوب ترنگ میں جو کلام ملتا ہے وہ عام مثنوی

نوٹ:- (۱) مخطوطہ کتب خانہ پیر محمد شاہ احمد آباد و اورینٹل کالج میگزین سنہ ۱۹۳۱ء (۲) اورینٹل کالج میگزین فروری سنہ ۱۹۳۱ء مضمون اور پروفیسر شیرانی۔ (۳) اردو کی ابتدائی نشو و نما از مولوی عبدالحق

کے ڈھنگ پر ہے۔

نمونۂ کلام

حکایت مرتبہ جمعیت و تفرقہ

ایک سکندر کا ہت یار — پوچھیا اونہیں سو ایکس بار
تم سب مشرق مغرب لیت — کس حکمت جگ فتح سو کیت
سکندر نے تب دیا جواب — منجہ کن ہت اک عمل شتاب
یہ لیوں ملک ہے جب دل — تب تا خیر نکیتی تل
چنہ توں نہیں ماریا ہشیار — تبلگ گون دشمن کون مار
کہیں شتابی نہیں جمیل — پن اس ہٹار کریں نہ ڈھیل
دل منہ آوے جیتی بار — رہیں خدا سوں تیتی بار
تاہی جمعیت اسی سنبہال[1] — ہر ہٹا نہ رہ حق سوں ہر حال

وغیرہ[2]

مذکورۂ بالا بزرگ وہ تھے جنھوں نے مثنوی کے طرز پر مذہبی نظمیں لکھ کر بعد کے آنے والے مثنوی نگاروں کے لیے راہیں کھول دیں ۔ اس دور کے بعد جو مثنوی نگار پائے جاتے ہیں انھوں نے مستقل طور پر مذہبی مثنویاں لکھی ہیں ہم یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

(باقی)

نوٹ [1] سنبھال ۔ سبنھار بمعنی یاد رکھ ہونا چاہیے [2] مخطوطہ پیر محمد شاہ کتب خانہ احمد آباد ۔

کریمی لائبریری

(حامد اللہ صاحب ندوی)

اس وقت بمبئی کے کتب خانوں میں صرف تین ایسے ہیں کہ جہاں عربی، فارسی اور اردو زبان کا لٹریچر بہ کثرت موجود ہے، بمبئی یونیورسٹی لائبریری، کتب خانہ مدرسۂ محمدیہ (جامع مسجد) اور کریمی لائبریری تینوں میں آخر الذکر علمی، فنی، اور ادبی اعتبار سے ایک ممتاز لائبریری ہے، اس کا مفصل تذکرہ کرنے سے پہلے ہم اول الذکر دونوں کتب خانوں کے کچھ اعداد و شمار پیش کرتے ہیں، جن سے ان کتب خانوں کا ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آجائے گا۔

یونیورسٹی لائبریری میں یوں تو انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، سنسکرت، اور اسی طرح دوسری زبانوں کی ہزارہا کتابیں موجود ہیں مگر چونکہ ہماری تلاش صرف عربی، فارسی اور اردو لٹریچر تک محدود ہے اس لیے صرف ان کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا، اس وقت ان زبانوں کا جو لٹریچر یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے، اس کا ایک حصہ مطبوعہ ہے، اور دوسرا غیر مطبوعہ، مطبوعہ کی تعداد بہ نسبت غیر مطبوعہ کے بہت بڑھی ہوئی ہے، عربی کی پانچ سو، فارسی کی ایک ہزار، اور اردو زبان کی تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابیں جمع کی گئی ہیں، ان میں قریب قریب وہ سب کتابیں آگئی ہیں جن کے بغیر ایک کتب خانہ ممتاز نہیں ہوا کرتا لیکن اس کے علاوہ بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جو صرف یونیورسٹی لائبریری کو حاصل ہیں، کتب خانہ مدرسۂ محمدیہ اور کریمی لائبریری میں نہیں پائی جاتیں، پہلی یہ کہ اس لائبریری میں ان زبانوں کا جو لٹریچر جمع کیا گیا ہے وہ جدید طرز کا ہے جہاں سینکڑوں کتابیں مشرقی مصنفین و محققین کی لکھی ہوئی موجود ہیں، وہاں

سینکڑوں مستشرقین کی تصنیف کردہ کتابیں بھی موجود ہیں، جن کے ذریعہ مشرق کی مشہور ہستیاں، اور ان کے کارناموں کے متعلق یورپ والوں کے نظریات ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ابن سینا، ابونصر فارابی، محقق طوسی، سعدی، حافظ، عمر خیام، امیر خسرو، اقبال اور اسی طرح مشرق کے دوسرے بہت سے پہلوؤں سے متعلق ان کی تحقیق اور ان کے معتقدات کا حال معلوم ہو جاتا ہے، دوسری یہ کہ اس لائبریری میں ان زبانوں کی بہت ساری مشہور کتابوں کے علاوہ دنیا بھر کی مشہور لائبریریوں کی فہرستیں موجود ہیں۔ جن سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ دنیا کے کس ملک اور کس لائبریری میں کتنی کتابیں ان زبانوں کی موجود ہیں۔ یہ خصوصیات کتب خانہ مدرسۂ محمدیہ اور کریمی لائبریری میں نہیں ہیں ان میں جو ذخیرہ جمع کیا گیا ہے وہ قیمتی ہونے کے باوجود اک طرفہ اور رجعت پسندانہ ہے۔

غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد پانچسو کے قریب ہوگی۔ ان میں اکثر و بیشتر وہ ہیں جو اس وقت مطبوعہ صورت میں کتب خانوں سے دستیاب ہو سکتی ہیں، مگر بعض ایسے نادر نسخے بھی موجود ہیں جن کا وجود اس وقت دوسری جگہ نہیں، ابھی تک اس کی فہرست نہیں بنی ہے، اس کام کیلئے جناب پروفیسر ندوی صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں، اور نادر نسخوں کی طباعت کیلئے کمیٹی نے کچھ رقم بھی منظور کی ہے امید ہے کہ یہ انتظام بہت جلد مکمل ہو جائیگا

یونیورسٹی لائبریری کے بعد کتب خانہ مدرسۂ محمدیہ ہے جو ۱۹۰۳ء میں قائم کیا گیا، چونکہ یہ کتب خانہ مدرسۂ محمدیہ کے سلسلے میں قائم کیا گیا تھا اس لیے جتنی کتابیں یہاں جمع کی گئیں وہ صرف عربی اور فارسی ہیں اردو کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے، علاوہ ازیں فنی اعتبار سے بھی ان میں اکثر وہ کتابیں آگئی ہیں جن کا تعلق درس نظامیہ سے ہے۔ اور اس وقت عموماً عربی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

موجودہ کتابوں کا ایک حصہ مطبوعہ ہے اور دوسرا غیر مطبوعہ، مطبوعہ کتابوں میں ایک ہزار عربی اور پانچسو کے قریب فارسی ہیں، غیر مطبوعہ کتابوں میں بھی ایک ہزار عربی پانچسو فارسی اور تقریباً دو سو اردو ہیں اس طرح کتابوں کی پوری تعداد تین ہزار سے بڑھی ہوئی ہے۔

اس کتب خانہ میں جو کتابیں جمع کی گئی ہیں ان میں درس نظامیہ کی تمام کتابوں کے علاوہ حدیث فقہ اور ادب کی بہت سی کتابیں نہایت قیمتی ہیں۔ حدیث میں آئمہ اربعہ کے مسانید، فقہ میں آئمہ اربعہ اور امام ابن تیمیہ کی فقہی کتابیں اور ادب میں بہت سے عربی شعرا و ادبا کے دیوان اور شاہپارے موجود ہیں، یہاں عربی ادب کا جو ذخیرہ ہے وہ کریمی لائبریری کے ادبی ذخیرہ سے زیادہ ہے۔ یہ کتب خانہ اپنی بہت سی کتابوں کے لیے بدرالدین صاحب قور اور عبدالقادر صاحب جیتے کر کا رہین منت ہے جنھوں نے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے بہت ساری کتابیں اس کو عنایت فرمائی ہیں، قلمی نسخوں میں بہت سے نادر نسخے چھان بین کے بعد نکل سکتے ہیں مگر اس سے کیا ہوگا، ہندستان میں کئی مرتبہ نادر نسخوں کی تفتیش و طباعت کے لیے آواز اٹھائی جا چکی ہے جس کا اثر صدا بہ صحرا کے علاوہ کچھ نہ ہوا۔ اب ہم دوبارہ اس کی صدائے بازگشت بننا نہیں چاہتے، آئندہ جو کچھ ہوگا ہوگا۔

ان دو کتب خانوں کے بعد کریمی لائبریری ہے جو ۱۸۹۸ء میں قائم کی گئی اس کے بانی قاضی عبدالکریم صاحب بلندری ہیں جو مطبع فتح الکریم، مطبع کریمی اور بمبئی کے دوسرے بہت سے مطابع کے مالک تھے، ان کا ۱۹۱۶ء میں انتقال ہوگیا، مرحوم نے اس لائبریری کی پرداخت کے لیے اسی شہر میں ایک مکان بھی وقف کیا ہے، جس کی مالیت وقف کے زمانہ میں پچیس ہزار روپے کی تھی، ان کے بعد ان کے فرزند جناب قاضی نور محمد صاحب خرچ چلاتے رہے ہیں۔ مرحوم نے اس کتب خانہ کی مطبوعہ فہرست پر جو دیباچہ رقم فرمایا ہے اس سے اسکے اغراض و مقاصد، اس کا قیام، اور اس کی ذمہ داریوں کی پوری تفصیل ہمارے سامنے آجاتی ہے اس لیے یہاں ہم اس کا کچھ انتخاب پیش کرتے ہیں۔

"بمبئی میں جس قدر کثرت سے اہل علم موجود ہیں بمقابلہ ان کے اسلامی کتب خانے بہت کم نظر آتے تھے، کوئی ایسا وسیع ہال اور کافی کتابوں کی لائبریری نظر نہیں آتی تھی کہ جہاں فرصت کے وقت ہمارے علم دوست دینی بھائی جمع ہو کر اپنے اپنے مذاق کے موافق کتابوں کے مطالعہ سے دل و دماغ

کو تر و تازہ فرماتے اور دل خواہ رسالوں کی سیر سے اپنی معلومات بڑھاتے اس لیے مدتوں سے میرا خیال تھا کہ کسی وسیع جگہ پر ایک ایسی اسلامی لائبریری کھولی جائے کہ ہمارے دینی بھائیوں کو مطالعۂ کتب کا استفادہ ہوا کرے اس لیے میں نے عالی جناب آنریبل جسٹس بدرالدین طیب جی صاحب صدر انجمن اسلام بمبئی کو درخواست لکھ کر بھیج دی کہ اگر انجمن اسلام ہائی اسکول کا ہال عنایت کیا جائے تو میں اس میں کتب خانہ قائم کردوں، صاحب موصوف نے نہایت خوشی کے ساتھ میری رائے سے اتفاق کیا اور میری درخواست کو منظوری کا شرف بخشا۔ پس میں نے سالہا سال کی تجسس اور تلاش سے کتابوں کا سرمایہ جمع کرکے اسی ہال میں ایک کتب خانہ بنام کریمی لائبریری انجمن اسلام بمبئی اپنے دلبند جگر پیوند میاں غلام محمد عرف دادا میاں مرحوم کی یادگار میں جاری کیا، خداوند عالم بطفیل رسولؐ اکرم اس کتب خانے کو مقبول خلائق کرے اور ہمارے دینی بھائیوں کو مطالعہ کتب سے ہدایت دارین عطا فرمائے:"

اس مضمون میں لائبریری کے تین مقصد بیان کیے گئے ہیں، مرحوم فرزند کی یادگار مسلم برادری کی ہدایت و تفریح اور تشنگان علم کی سیرابی، جہاں تک پہلے مقصد کا تعلق ہے وہ بحیثیت تمنائے پدری اس لائبریری کے قیام اور تکمیل کے بعد پورا ہو گیا اور بحیثیت یادگار اس وقت تک پورا ہوتا رہے گا جب تک کہ یہ لائبریری اسی نام سے قائم رہے گی اور لوگ اس سے استفادہ کرتے وقت یہ معلوم کرتے رہیں گے کہ اس لائبریری کو جناب قاضی عبدالکریم صاحب نے اپنے مرحوم فرزند غلام محمد عرف دادا میاں کی یادگار کے لیے قائم کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر انتظام ہو جانے کے بعد بھی اس لائبریری کے پرانے نام کو برقرار رکھا گیا، اور ابھی تک مخلص بانی کے رکھے ہوئے نام ہی سے یاد کی جارہی ہے، دوسرا مقصد چونکہ مسلم برادری کی ہدایت و تفریح تھا، اس لیے جتنا لٹریچر جمع کیا گیا اس کا ایک حصہ مذہبی ہے تو دوسرا حصہ ادبی جس میں شاعروں کا کلام ناول، اور ادبی شہ پارے وغیرہ شامل ہیں، تیسرا مقصد تشنگان علم کی سیرابی تھی یہی وجہ ہے کہ

لٹریچر کے جمع کرنے میں اک طرفہ پالیسی نہیں برتی گئی، جس طرح مسلم مصنفین کی کتابیں فراہم کی گئیں اسی طرح غیر مسلم مصنفین کی کتابوں کا بھی اہتمام کیا گیا ہے دونوں کے لیے شرط یہی رکھی گئی کہ کتاب سود مند ثابت ہو، جہاں قرآن حدیث فقہ اور ان سے متعلق سینکڑوں کتابیں مذہب اسلام کی موجود ہیں وہاں وید، رامائن بھگوت گیتا اور ان سے متعلق بھی بیسیوں کتابیں ہندو مذہب کی مہیا کی گئیں اور مطالعہ کے دروازے سب کے لیے یکساں کھلے رکھے گئے۔

اس وقت کریمی لائبریری میں سات سو عربی، نوسو فارسی، اور کم و بیش تین ہزار اردو زبان کی کتابیں ہیں، علاوہ ازیں چار سو انگریزی، اور ایک سو کے قریب گجراتی زبان کی کتابیں بھی موجود ہیں، جملہ کتابوں کی تعداد پانچ ہزار کے قریب ہے، کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت بمبئی میں عربی فارسی اور اردو لٹریچر کے لیے اس سے زیادہ ممتاز لائبریری کوئی نہیں، مجموعی طور پر عربی زبان کی وہ تمام کتابیں موجود ہیں جو عموماً عربی درس گاہوں میں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن اس کے علاوہ بھی ہر فن میں بہت سی ایسی کتابیں جمع ہوگئی ہیں جن کو نایاب یا قیمتی کہنا بے جا نہ ہوگا، ترجموں میں شاہ ولی اللہ کا فارسی ترجمہ تفسیروں میں تفسیر عبداللہ بن عباس تفسیر ابن عربی، تفسیر کبیر، احادیث میں صحیح بخاری، موطأ امام مالک اور ابوداؤد کی مختلف شرحیں اور فقہ میں مشہور درسی کتابوں کے علاوہ فتاوی قاضی خاں، فتاوی عالمگیری، نیل الاوطار وغیرہ قابل ذکر ہیں، ادب نسبتاً مختصر ہے پھر بھی نثر میں الکنز المدفون، عقد فرید، سالب الهموم، نظم میں جنبل مصری، مشوق، اور ابن فارض کا تذکرہ بیجا نہ ہوگا، مذہبی علوم اور ادب کے علاوہ تاریخی کتابیں نہایت قیمتی ہیں، اس فن کی وہ تمام کتابیں موجود ہیں جن کو موجودہ دور کی تاریخوں کا سرچشمہ کہنا چاہیئے؛ اس کے لیے تاریخ الخلفاء، کتاب الخطط والآثار، تاریخ کامل ابن اثیر، تاریخ ابن خلدون، تاریخ ابن خلکان، اور کتاب الملل والنحل کا ذکر کافی ہوگا، غرضکہ عربی زبان کا لٹریچر مختصر ہونے کے باوجود اس قدر جامع ہے کہ ایک استفادہ کرنے والا اپنے کسی

موضوع کے لیے بھی مایوس نہیں ہو سکتا۔

فارسی زبان میں جو کتابیں جمع کی گئی ہیں ان میں مذہبی کم اور ادبی زیادہ ہیں، مذہبی کتابوں میں شاہ عبدالعزیز کی تفسیر عزیزی اور مولوی نورالحق دہلوی کی تیسیر القاری شرح صحیح بخاری کو نہایت قیمتی کہنا چاہیئے، اور ادبی کتابوں میں نظم و نثر کے لیے فردوسی و ظہیر فاریابی سے لے کر غالب و بیدل تک اور ابوالفضل سے لے کر مادھو رام تک تقریباً تمام مشہور شاعروں اور ادیبوں کے دیوان، قصائد، اور انشاآت موجود ہیں، فارسی زبان کا تاریخی حصہ بھی بہت اہم ہے، تذکرہ، سیرت، اور تاریخ کی وہ تمام کتابیں موجود ہیں جن کی مدد سے آج کل کی تاریخیں، تذکرے، اور سیرتیں مرتب کی جاتی ہیں تاریخوں میں تاریخ فرشتہ، تاریخ طبری تاریخ جہاں کشائے نادری وغیرہ تذکروں میں آتش کدہ آذر تذکرۂ دولت شاہ، خزانۂ عامرہ وغیرہ، اور سیرت کی کتابوں میں حبیب السیر، روضۃ الصفا سیر المتاخرین، اور نفحات الانس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ فارسی زبان کا ادبی اور تاریخی ذخیرہ اس قدر اہم ہے کہ اس کی مدد سے ایک نقاد، تذکرہ نویس، اور تاریخ کا مرتب بہت فائدہ اٹھا سکتا ہے،

عربی اور فارسی کے بعد اردو زبان کا لٹریچر ہے جو دونوں سے کئی گنا زیادہ ہے، اس زبان میں بھی مذہبی کتابیں کم ہیں، مگر اس کا ادبی ذخیرہ نہایت شاندار ہے، اردو ادیبوں میں سرسید شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد، شرر، سرشار، ذکاءاللہ اور شاعروں میں ولی سے لے کر حالی تک تمام مشہور شاعروں کے کلیات، دیوان، مثنویات، اور قصائد موجود ہیں، ناولوں اور افسانوں کو چھوڑ کر صرف ادبی نظم و نثر کی کتابوں کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے،

ہم نے یہاں عربی، فارسی، اور اردو کتابوں کا جو جائزہ پیش کیا ہے یا کتابوں کے جو نام گنوائے ہیں، وہ مختصر اور صرف تقریب ذہن کے لیے ہے، ورنہ پورا کتب خانہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، تحقیق و تفتیش کے بعد بہت سی ایسی کتابیں بھی برآمد کی جا سکتی ہیں جو اس وقت ہندوستان ہی میں ناپید

ہوں گی۔

یہ کتب خانہ انجمن اسلام ہائی اسکول کے زیرِ نگرانی سال بہ سال ترقی کرتا رہا۔ اسکول کے طلباء اور اساتذہ کے علاوہ باہر کے لوگ بھی اس سے استفادہ کرتے رہے، ان لوگوں کے نام جنھوں نے تین روپے چندہ سالانہ اور کچھ رقم بہ طور ضمانت داخل کرادی، کتابیں بھی اجراء کی جاتی رہیں، دن بہ دن کی ترقیوں کو دیکھتے ہوئے انجمن نے اس کتب خانہ کی رجسٹری کرادی اور اس کا پورا انتظام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ذمہ کر دیا، فی الحال یہ کتب خانہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ نگرانی ہے، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور لائبریرین کی اجازت کے بغیر اب کوئی کتاب جاری نہیں کی جاتی، اس کو مقبول عام بنانے اور عوام کو استفادہ کی مزید سہولتیں پہونچانے کی غرض سے ایک اسکیم بنائی گئی ہے، جو بہت جلد منظوری حاصل کر کے زیرِ عمل آجائے گی، اس کا تفصیلی تذکرہ ہم کسی آئندہ اشاعت میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے تحت کردیں گے۔

خط

ہندی باغ، علی گنج، ٹونک راجپوتانہ
۲ راگست ۱۹۴۰ء

محترمی پروفیسر ابراہیم صاحب

عنایت نامہ پہونچا۔ شکریہ۔ شیریں خسرو کا محشی نسخہ اگر اس کو محشی کہا جا سکتا ہے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ہے اگر مجھے کوئی حاشیہ والا نسخہ ملا تو میں آپ کے لیے لے لوں گا۔ اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف تحریر کیجئے۔ حتی الامکان تعمیل میں کوتاہی نہیں کروں گا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شیریں خسرو، سکندر نامہ اور مخزن اسرار کے مقابلہ میں کبھی سرسبز نہیں ہوئی، اس کے قلمی نسخے بہت کم ملتے ہیں، ادھر سکندر نامہ اور مخزن اسرار کے درجنوں نسخے محشی اور غیر محشی دستیاب ہوتے ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ یہاں میرے پاس انوری کی کوئی شرح موجود نہیں کہ میں آپ کو لکھنے سے پیشتر آپ کے مستفسرہ اشعار کے متعلق اپنا اطمینان کر لیتا۔ بحالت موجودہ میرے خیال میں آپ کی دقت زیادہ تر غلط متن کی بناء پر نہ اشعار مستفسرہ میں کسی پیچیدگی کی بناء پر۔

ذیل میں ان اشعار کا مطلب جو کچھ سمجھتا ہوں لکھتا ہوں۔

۶۔ تقدیم[1] تو جائیست الخ یعنی تیرا تقدم (اولیت و شرف) ایسا مقام ہے جس کی پیروی سے آسمانوں کو قدم کی باگ موڑنی نہیں پڑتی۔ یعنی یہ جو آسمانوں کو قدیم کہتے ہیں تو یہ قدامت انھیں تیرے شرف و بزرگی کی پیروی سے حاصل ہوئی ہے۔ اب اگر اس سے منھ موڑنا بھی چاہے تو نہیں موڑ سکتا۔

۳۲ و ۳۳۔ تا خاک در آمد شد ہر کائن و فاسد　　پرداختہ و پر کبند پشت و شکم را الخ اگر پر کند کی جگہ پر کبند پڑھا جائے تو معنی زیادہ مدلل اور مناسب ہوں گے۔ پرداختن (خالی کرنا) پر کردن کا نقیض ہے مصرع اول میں الفاظ امتداد آمد، شد، کائن و فاسد آرہے ہیں شاعر کا مطلب ہے کہ جب تک خاک ہر موجود

---

[1] تقدیم تو جائیست کہ از پس روی او　　افلاک عناں باز نتابند قدم را

و معدوم کی آمد و رفت سے اپنی پشت کو خالی اور شکم کو بھرتی رہے تب تک زمین کی پشت پر تیرا با سعادت قیام رہے کیونکہ آسمان کے پیٹ میں زیر آسمان ایک تیرا ہی وجود ایسا ہے جس سے آسمان کو شادی اور غم حاصل ہو سکتا ہے بالفاظ دیگر تیری موجودگی سے راحت اور تیری عدم موجودگی سے غم۔ قصیدہ دوم

۲۷ و ۲۸۔ زغایت کرم اندر مزاج تو نی نیست   در اعتقاد تو ضد است نون گم یی را

شعر ہٰذا کے قافیہ میں 'نے' کی جگہ 'یی' حرف تہجی کا آخری حرف چاہیئے یعنی (ی) خواہ اسے آپ بصورت 'یا' لکھیں یا بصورت 'یی' اور مطلب یہ ہے کہ بربنائے انتہائے کرم تیرے کلام میں کلمۂ نفی یعنی 'نے' نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'نون' تیرے نزدیک شاید 'یے' کا نقیض واقع ہوا ہے اور کہ یہ دونوں حرف ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہو کہ

۲۹۔ بہیچ لفظ تو 'نوں' ہم بر یا نہ پیوندد   وجود نیست مگر در ضمیر تو نی را

مصرع اول میں 'بنا' کی جگہ 'بریا' چاہیئے 'یا' وہی حرف تہجی ہے۔ اور شاعر کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ تیری گفتار میں کوئی ایسا لفظ نہیں آتا جس میں 'نون' اور 'یے' کی ترکیب واقع ہوئی ہو ان دونوں سے کے اور یہ 'نے' ایسا لفظ ہے جو تیرے ضمیر کی لغت میں موجود نہیں ہے۔

اس علاقہ میں سخت قحط تھا۔ اب پرسوں سے یہاں سخت بارش شروع ہوئی ہے اور آج تو دن بھر ہوتی رہی۔ موسم یکایک بہت خنک ہو گیا ہے۔ راتوں کو سردی لگ رہی ہے۔

پیرس کے ڈاکٹر کو اب بھی آپ 'ماسٹر' لکھ رہے ہیں۔ اچھا اگر میں جناب ڈاکٹر صاحب کو آپکی اس گستاخی اور غلط بیانی کی اطلاع دوں تو پھر کہیئے کہ آپ پر کیسی بنے گی۔ آپ تو بہ کیجئے تو بہ! اور سات مرتبہ اعوذ باللہ پڑھیئے۔

لاہور میں بروقت ملاقات اپنے اردو کے چند قطعوں کا ذکر کیا تھا جو برائے فروخت ہیں اور میں نے یہ سن کر کہا تھا کہ وہ دہلی کی نمائش میں میں نے دیکھے تھے۔ مہربانی کر کے مجھے بتایئے کہ مالک کم سے کم ان چھ عدد کیلئے کیا قبول کریگا۔ جواب ٹونک کے پتہ پر دیجئے میں ۲۰ ستمبر تک یہاں ہوں۔ ہاں خوب یاد آیا آپ کوئی فرمان مجھے بھیج رہے تھے وہ کیا ہوا؟ والسلام

محمود شیرانی

مقالہ نما

مرتبہ باقر علی ترمذی

امریکہ کے سہ ماہی رسالہ "مڈل ایسٹ" میں مشرق وسطیٰ کے متعلق اجتماعی، اقتصادی اور علمی مسائل پر بہت پرمغز مقالات شائع ہوتے ہیں، مشرق وسطیٰ کے متعلق تمام دستاویزوں کا جمع کرنا اور ان ممالک کے اہم واقعات کا تاریخ وار اندراج اس رسالہ کی اہم خصوصیات میں سے ہے، اس مجلہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں ایک ضمیمہ بنام "ببلیوگرافی آف پیریاڈیکل لٹریچر آن دی نیر اینڈ دی مڈل ایسٹ" ملحق ہوتا ہے اور اس ضمیمہ میں مشرق وسطیٰ کے متعلق جتنے مقالات انگریزی، فرانسیسی، اطالوی جرمنی روسی، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی توضیحی فہرست پیش کی جاتی ہے، اس مہتم بالشان کارنامہ کو دیکھ کر ہمیں یہ خیال ہوتا تھا کہ اردو رسالوں کے مقالات کی فہرست اسی نہج پر تیار کی جائے تو بہت مفید ثابت ہوگی لیکن تن تنہا اس کام کو انجام دینے کی ہمت نہ ہوتی اور یہ کام ویسا ہی پڑا رہتا، اگر محترمی پروفیسر محمد ابراہیم صاحب ڈار ہماری حوصلہ افزائی نہ فرماتے، چنانچہ محترم دوست جناب ڈاکٹر ظہیر الدین صاحب مدنی نے جب ہم سے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی طرف سے شائع ہونے والے "نوائے ادب" کے لیے مضمون لکھنے کا تقاضا کیا تو ہم نے خیال کیا کہ بجائے مضمون لکھنے کے اگر مقالات کی توضیحی فہرست ہی مرتب کردی جائے تو اس بہانے سے ہمیں اردو ادب میں ایک نئی چیز کے پیش کرنے کا موقع مل جائے گا، امید ہے کہ اردو داں حضرات اس بدعت حسنہ کو پسند فرمائیں گے۔ اس فہرست کے مرتب کرتے میں جو متعدد خامیاں رہ گئی ہیں ہمیں ان کا پورا احساس ہے لیکن ہم امید کرتے ہیں کہ اہل علم ان سے درگذر کریں گے، اگر حالات نے مساعدت کی تو آئندہ ہم ان خامیوں اور کوتاہیوں کا بہت حد تک تدارک کرسکیں گے،

مذہبیات

۱۔ آزاد۔ مولانا ابوالکلام۔ لاتکفرو! بایدیکم الی التھلکہ (پیشوا ۱۴ر اکتوبر ۲۳۔۴۵)

اس آیت کی صدر اسلام میں تفسیر، نیز ... کے معنی پر لغوی اور تفسیری بحث۔

۲۔ اداریہ۔ اسلام اور نظریۂ وحدت ادیان (الفرقان ۶۸ صفر ۱۱۔۱۶) وحدت ادیان کے معنی جیسا کہ گاندھی جی وغیرہ نے صراحتہ بتایا ہے یہ ہیں کہ سب مذاہب دراصل ایک ہی ہیں اور سب سچے ہیں اور اس لیے نجات کسی خاص دین و مذہب کی پیروی میں منحصر نہیں ہے، اسلام کا دعویٰ اور اس کی دعوت اس کے برخلاف ہے۔

۳۔ جامعی۔ خلیل احمد جگت گرو (پیشوا ۶۹ ربیع الاول ص ۲۳۔۰۰) مسلمان رسول اللہ صلعم کو سردار عالم کہتے ہیں، دنیا کا لیڈر یا جگت گرو ہونے کے لیے یہ چار شرطیں ضروری ہیں (۱) اس نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو (۲) اس نے ایسے اصول پیش کیے ہوں جو تمام دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں (۳) اس کی رہنمائی کسی خاص زمانہ کے لیے نہ ہو بلکہ ہر زمانہ اور ہر حال میں یکساں مفید ہو (۴) اس نے صرف اصول پیش کرنے پر ہی اکتفا نہ کی ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کرکے دکھایا ہو، اور یہ چاروں شرطیں رحمت عالم میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

۴۔ دریابادی۔ عبدالماجد۔ امیر خسرو (پیشوا ۱۹ ۴ اکتوبر ۴۵ ۔ ۳۸) حضرت امیر خسرو دہلوی کا تعارف بحیثیت صوفی۔

۵۔ غلام ربانی۔ قرآن کے تحفظ پر ایک تاریخی نظر (برہان ۴۹ اکتوبر ۱۷۔۳۴) مضمون کی یہ پانچویں قسط ہے اس قسط میں کلام مجید کی نزولی ترکیب پر بحث کی گئی ہے اور مستشرقین نے جو اعتراضات کیے ہیں ان کا مفصل جواب دیا گیا ہے۔

۶۔ غلام یٰسین۔ حضور انور کی بعثت کے متعلق کتب مقدسہ کی پیشین گوئیاں (پیشوا ۶۹ ربیع الاول ۱۳۔۱۹) زردشتی عیسائی اور یہود کی مذہبی کتابوں میں رسول مقبول کے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہوئی ہیں ان کا تذکرہ۔

۷۔ گیلانی۔ مناظر احسن۔ حج کی بے (پیشوا ۹ ۴ اکتوبر ۱۰۔۲) تمام دنیا کے لیے کعبۃ اللہ کی مرکزیت پر بحث کی ہے اور مکہ کا مرکز دنیا ہونے کے لیے زبور و انجیل سے ثبوت بہم پہنچائے ہیں، اول بیت وضع للناس کی بحث ... حج میں جو والہانہ پن پایا جاتا ہے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۸۔ ندوی۔ عبدالباری۔ تصوف و سلوک (الفرقان ۸ ذی الحجہ ۱۸۔۳۲) اس مضمون کی چوتھی قسط ہے اس میں توجہ و تصرف بیعت و ارادت اور صحبت و تعلق کا ذکر ہے۔ مضمون میں اکثر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تصوف کی کتابوں کے اقتباسات اور ان کے خیالات پائے جاتے ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ مضمون مولانا ہی کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔

۸۔الف۔ **نورالحق**۔ سورہ بقرہ میں ربط آیات (اورینٹل کالج میگزین ۹۴۹ء نومبر ۳۔ ۴۶)

ربط آیات کے متعلق عربی فارسی اور اردو میں چند کتابیں موجود ہیں جن میں ہر کتاب میں ایک آیت کو دوسری آیت سے مربوط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس مضمون میں سورۂ بقرہ کا بحیثیت مجموعی مطالعہ کیا ہے اور اس پوری سورت میں جو ربط پایا جاتا ہے اس کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں دراصل خطاب یہود سے ہے اس سورہ میں معاشرت، سیاست، مدنیت وغیرہ کے جو حقائق پوشیدہ ہیں ان کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے مقالہ مضمون نگار کے علمی تبحر اور حقائق قرآنیہ پر غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

جغرافیہ

(عمومی جغرافیہ، سیاحت، تاریخ طبعی، ارضیات)

۹۔ **گیتی آرا بیگم**۔ مسز بشیر احمد۔ ترکیہ پر ایک نظر (ہمایوں ۹۴۹ء اکتوبر ۶۱۴۔ ۶۱۷) انھوں نے ترکی پہونچنے پر اپنے چند محسوسات کو قلمبند کیا ہے اور ساتھ ہی وہاں کی چند مشہور قابل دید چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

تاریخ و سیاست

(دور قدیم، دور وسطیٰ، دور جدید)

۱۰۔ **احتشام حسین**۔ حالی کے سیاسی شعور کا تجزیہ (شاہراہ ۳ دسمبر ۹۴۹ء۔ ۵۵) حالی کا سیاسی شعور ماضی اور مستقبل کی طرف نگراں تھا۔ دور تحریکوں عقیدوں اور خیالات سے وجود میں آیا تھا، ماضی کی نیم مذہبی نیم سیاسی تحریکیں اور مستقبل کے امکانات کے میل جول سے کوئی ایسا تصور زندگی پیدا کرنا تھا جو مذہبی اخلاقی اور دنیاوی حیثیت سے مفید ہو، حالی اپنی نظم و نثر میں مسلسل اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں حالات کا ساتھ دے کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیئے۔

۱۱۔ **احمد ایم بی**۔ تاریخ کی نئی تدوین (ماہ نو ۹۴۹ء نومبر ۵۸۔ ۶۰) انگریزی دور میں ہندستان کی جتنی تاریخیں لکھی گئیں وہ تعصب کا زہر ملا رنگ پھیلانے کی غرض سے وجود میں آئیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستان کی تاریخ از سر نو لکھی جائے۔

۱۲۔ **اداریہ**۔ سمندر پار کے ہندستانی (نئی زندگی ۹۴۹ء اکتوبر ۳۔ ۴) سمندر پار کے ممالک میں بسنے والے تیس لاکھ ہندستانیوں کا تذکرہ ان کے حالات اور ان کے مسائل، یہ ہندستانی جنوبی افریقہ مشرقی افریقہ، ماریشیش، فجی، برما، ملایا، انڈونیشیا، لنکا مشرق وسطیٰ وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۱۳۔ **پنڈت**۔ قاری محمد بشیر الدین۔ بلبن اور اس کے اصول حکومت (الفرقان ۶۸ صفر ۱۴۰۲ھ) بلبن نے عدل و مساوات اور رعیت پروری کے سنگین اصولوں پر اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی ۱۲۸۰ء کے ایک نیم سنسکرت کتبہ میں لکھا ہے کہ اس کی رعایا پروری اور عدل گستری کو دیکھ کر وشنو دیوتا کو اب اس کی فکر نہیں رہی کہ وہ دنیا کی دیکھ بھال کریں اس لیے وہ بشرام (آرام) کرنے کے لیے شیر ساگر (دودھ کے سمندر) کو چلے گئے ہیں۔

۱۴۔ **شمشاد احمد**۔ قدیم ہند کی نوآبادیات (آج کل ۹۴۹ء دسمبر ۲۰۔ ۲۳) ہندستانی قرب و جوار کے ممالک مثلاً چینی ترکستان، لنکا سیام برما وغیرہ میں ہندستانیوں کی آبادی موجود تھی، نیز ان ممالک کے باشندوں پر ہندستانی تہذیب و تمدن کا گہرا اثر پڑا ہے، مضمون ایک نہایت ہی مجمل خاکہ پیش کرتا ہے۔

۱۵۔ **عزیز احمد**۔ محمد۔ اسلام میں حکومت کا نظریہ (ہمایوں ۹۴۹ء اکتوبر ۵۹۳۔ ۵۹۶) اسلام میں خلافت کا تصور، خلیفہ کے اوصاف، تقسیم اختیارات حکومت، رضائے عامہ وغیرہ پر مختصر بحث، یہ بتانے کی کوشش کہ ان خیالات کا یورپ میں چرچا ہونے کے ہزار سال قبل اسلام نے ان کو مروج کر دیا تھا۔

۱۶۔ **کوثر**۔ نثار علی۔ وفاقیہ میں تقسیم اختیارات (عثمانیہ ۹۴۹ء ص ۹۔ ۱۲) وفاقیہ میں دو قسم کی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم عمل میں آتی ہے، ایک مرکزی حکومت ہوتی ہے اور دوسری مقامی حکومت، یہ تقسیم اختیارات چند طریقوں سے کی جاتی ہے مثلاً دونوں حکومتوں کے اختیارات کی فہرست مرتب کر لی جائے یا دو میں سے ایک حکومت کی فہرست تیار کی جائے اور باقی ماندہ اختیارات دوسری حکومت کو دیئے جائیں، اس مضمون میں ان تمام طریقوں کا بیان ہے جن کے مطابق اختیارات تقسیم ہو سکتے ہیں اور ہر طریق کے فوائد اور نقصانات بتائے گئے ہیں۔

۱۷۔ **متل**۔ گوپال۔ آزاد پختونستان (نئی زندگی ۹۴۹ء اکتوبر ۲۹۔ ۳۱) اورنگ زیب کے زمانہ میں یوسف زئی، آفریدی اور خٹک قبائلیوں کی بغاوت کا پس منظر اور موجودہ آزاد پختونستان کا مسئلہ، مضمون نگار کا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندستان دونوں کو مل کر اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہیئے۔

۱۸۔ **محمد ظفر اللہ خاں**۔ اطالوی نوآبادیات کا مستقبل (ماہ نو دسمبر ۸۔ ۱۰) شمالی افریقہ کے اطالوی مقبوضات کا مسئلہ، یو این او میں پاکستان کا رویہ، اور یو این او میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا نہایت مختصر خلاصہ۔

الف ۱۸۔ مخلص انند رام بدائع و قائع (اورینٹل کالج ۹۴۹ء نومبر ۱۔ ۳۲) بدائع وقائع مصنفہ انند رام مخلص کی آخری فصل۔

اس فصل میں تاریخ پنجاب کے وہ واقعات درج ہیں جو جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ سے لے کر جمادی الثانی ۱۱۶۱ھ تک وقوع پذیر ہوئے۔ اس بیان کا اکثر حصہ احمد شاہ ابدالی کے پہلے حملے کی کیفیت اور اس کے شکست کھانے کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ بہ تاریخ کی فصل ہذا خان بہادر مولوی محمد شفیع نے ایڈٹ کی۔

۱۹۔ مہر۔ غلام رسول۔ شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید اور مولانا عبیداللہ سندھی (ماہ نو ۴۹ دسمبر ۲۷-۳۱) سید احمد شہید بریلوی کی مستقل تحریک آزادی کے سلسلہ میں مولانا عبیداللہ سندھی کو چند غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ مضمون میں ان کے ازالہ کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۰۔ ندوی۔ ابو الجلال۔ سنگ شام۔ یہود اور حمیر کی تاریخ کا ایک مشترک ورق (معارف اکتوبر ۲۷۵-۲۹۲) حضرت یعقوب علیہ السلام جب فدان ارم سے واپس آئے تو شہر شالم کے سامنے ایک کھیت میں انھوں نے اپنا خیمہ نصب کیا حمور اس شہر کا رئیس تھا اس کا بیٹا شکم دینہ بنت یعقوب پر عاشق ہو گیا، اور دونوں قوموں کے درمیان بیاہ کی گفت و شنید شروع ہوئی اسی کہانی کو جو یہود اور حمیر دونوں سے تعلق رکھتی ہے یہاں توراتی اور دیگر وثائق کی روشنی میں بیان کیا ہے۔

۲۱۔ ندوی۔ ابو الجلال سنگ شام (معارف ۴۹ نومبر ۳۵۶-۳۶۶) سنگ شام کی تشریح، حجر شام کا کتبہ اور ترجمہ و توضیح، توریت کے وزن اور کتبہ کے وزن کا مقابلہ، کتبہ کا زمانہ اور اس کی زبان۔

۲۲۔ ندوی۔ ابو الجلال۔ تاریخ یمن کی ایک سطر (معارف ۴۹ دسمبر ۴۶۴-۴۷۲) حضر موت سے چند حمیری کتبے ۱۸۳۴ء میں دستیاب ہوئے تھے ان کتبوں کے متعلق بعض یورپ کے ماہرین کا خیال ہے کہ ان کا زمانہ تحریر طوفان نوح سے ۵۰۰ برس بعد حضرت یوسف کا عہد ہے، لیکن مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں سے ایک کا زمانہ تحریر ۳۳۰ء ہے دوسرے کا اس کے کچھ پہلے اور تیسرے کا ۳۳۲ء سے کچھ بعد۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۳۔ اداریہ۔ خیر البشر (مولوی ۴۹ صفر ۳-۱۹) رسول مقبول کی سوانح طیبہ کے چند پہلوؤں پر گفتگو مثلاً رحم و مروت، فروتنی و انکساری ایفائے عہد، اولاد سے محبت امانت و دیانت، عفت و عصمت، بیویوں سے محبت وغیرہ

۲۴۔ افسر۔ حامد اللہ۔ شاہ دولہا (ماہ نو ۴۹ نومبر ۳۰-۳۲) گجرات (پنجاب) کے ایک مشہور درویش شاہ دولہا کا تذکرہ، شاہ دولہا کا سنہ پیدائش ۱۵۸۱ء اور سال وفات ۱۶۷۶ء ہے شاہ نے متعدد مسجدیں، کنوئیں، سرائیں اور پل بنوائے، خلق خدا کی فلاح و بہبودی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔

۲۵۔ حسنی۔ محمد رابع۔ مردان حق کی حق گوئی و بےباکی (الفرقان ۴۸ صفر ۳۵-۴۰) اسلامی تاریخ میں سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کے صدہا واقعات ہیں، اس مضمون میں ہندوستان کے چند حق گو علماء کا اور ان کی حق گوئی کا تذکرہ کیا ہے علاء الدین برنی، قاضی مغیث الدین، شہاب الدین جاجی اور فخرالدین نورادی کے قصے بیان کیے ہیں۔

۲۶۔ حمیدہ سلطان۔ باقر علی خاں کامل (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۷۸-۸۹) غالب کی بیوی کے بھانجے مرزا زین العابدین عارف کے فرزند مرزا باقر علی خاں کامل نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے داماد تھے: اس مضمون میں باقر علی خاں کے خاندان، ان کی بیوی، اور اولاد کا تذکرہ ہے۔

۲۷۔ خان۔ حمیدہ احمد۔ امراؤ بیگم (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۸۰-۸۶) امراؤ بیگم اور مرزا غالب کے باہمی تعلقات ادبی سوانح کا ایک دلچسپ مسئلہ بن چکے ہیں، اس مضمون میں اسی مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں چھیڑ چھاڑ ہو جاتی تھی لیکن میاں بیوی کے یہ جھگڑے کبھی کسی دائمی فساد یا بدمزگی کا باعث نہیں بنے۔

۲۸۔ خواجہ۔ عبدالرشید۔ طاہرہ بانو (زمان ۴۹ دسمبر ۳۸۱-۳۸۲) طاہرہ بانو جس کو محبوب الدولہ والے مضمون میں ملک الشعراء بہار کی صاحبزادی بتایا گیا تھا وہ دراصل امیر علی معصومی کی بیٹی ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر رہ چکی ہیں طاہرہ خاتون کا تعارف مضمون ہذا کا مقصد ہے۔

۲۹۔ رشدی۔ محمد حبیب اللہ۔ وحید الدین سلیم پانی پتی (آج کل ۴۹ دسمبر ۵-۷) پروفیسر سلیم حیدرآباد میں اردو کے اولین پروفیسر تھے، ان کی علمی خدمات، علمی تبحر، اخلاق و عادات، وغیرہ کا تذکرہ تذکرہ جدید اصول کے مطابق لکھا ہے مضمون نگار پروفیسر سلیم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

۳۰۔ سبزواری۔ شوکت۔ غالب کی شخصیت (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۳۵ تا ۴۱) غالب بڑی شخصیت کے مالک تھے ان کی شخصیت کی عظمت کا راز ان کی غیر معمولی فکری صلاحیتیں ہیں، غالب جدت پسند ہی نہیں وقت پسند بھی ہیں ان کی شخصیت کا جوہر ارادہ کی پختگی اور عقیدہ کی استواری

ہے، غالب کا کلام ان کی شخصیت کا آئینہ ہے ان کی شخصیت طلب طمع حرص و آز اور زبونی ہمت کی تمام لعنتوں سے پاک ہے۔ ۳۰۔ سرور، آل احمد۔ غالب کی عظمت (علی گڑھ میگزین ۵۰ غالب نمبر حقوق نمبر ۲) غالب کی فکر و نظر اور ان کے فن کی اہمیت واضح کی گئی ہے اور ان کی عظمت کے راز کو بیان کیا گیا ہے۔

۳۱۔ سیماب اکبرآبادی۔ سر سید رضا علی مرحوم کا ادبی مقام (زمانہ نو ۴۹ دسمبر ۱۱-۱۳) سر رضا علی کا ایک ادبی مقام ہے وہ ترقی و تہذیب یافتہ اسلاف کا نمونہ تھے، عربی اور فارسی زبانوں سے واقف تھے، اردو اور فارسی شعرا کا مطالعہ بامعان نظر کیا تھا اس لیے انھیں اساتذہ قدیم و جدید کے سیکڑوں اشعار زبانی یاد تھے، مضمون میں زیادہ تر ان کے اردو مشاعروں کی صدارت کا تذکرہ کیا ہے،

۳۲۔ الف محمد شفیع خان بہادر مولوی۔ آنند رام مخلص (اورینٹل کالج ۴۹ نومبر ۱-۳) آنند رام مخلص کا غیر مطبوعہ خندوں سے نہایت مختصر تذکرہ تفصیلی تذکرہ کے لیے دیکھو اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۱ء نومبر۔

۳۳۔ شہابی اکبرآبادی۔ امیر الامرا نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ اور جنگ پانی پت (برہان ۴۹ اکتوبر ۲۳۷-۲۴۰) نجیب الدین خاں کا تعلق روہیلہ برادری سے تھا، ان کے چچا بشارت خاں سلسلۂ تجارت آخر زمانہ فرخ شاہی میں دہلی آئے ۱۱۱۹ھ میں نجیب الدین خاں کی پیدائش ہوئی، اور ۱۱۳۸ھ میں اپنے چچا کے ساتھ ہندستان آ کر رہنے لگے یہ مضمون سلسلہ کی دوسری کڑی ہے اس مضمون کی ابتدا میں نادری اور ابدالی حملوں کا تذکرہ اور ان کا پس منظر بیان کیا گیا ہے،

۳۴۔ شہابی اکبرآبادی۔ امیر الامرا نواب نجیب الدولہ ثابت جنگ اور جنگ پانی پت (برہان ۴۹ نومبر ۲۸۹-۲۹۶) سلسلۂ مضامین میں یہ تیسری کڑی ہے، اس قسط میں نجیب الدین خاں کے ابتدائی حالات سے بحث کی ہے نیز نواب رحمت خاں کا تذکرہ بطور پس منظر بیان کیا ہے۔

۳۵۔ شہابی اکبرآبادی۔ نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت (برہان ۴۹ دسمبر ۳۶۳-۳۷۰) سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے اس قسط میں دہلی کا محاصرہ اور شاہ ابدالی کے حملوں کا مفصل بیان ہے۔

۳۶۔ صالحہ عابد حسین۔ حالی کی سیرت کی ایک اہم خصوصیت (آج کل ۴۹ اکتوبر حصہ دوم ص ۱۱-۱۳) مولانا حالی کی بے تعصبی کی خصوصیت کا ذکر ان کے مسدس اور دیگر تصانیف سے ہندو مسلم اتحاد اور اردو ہندی کے مسائل پر ان کی رائے۔

۳۷۔ صباح الدین۔ عبد الرحمٰن۔ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی (معارف ۴۹ اکتوبر ۲۶۳-۲۷۸) حضرت چراغ دہلوی کی سوانح حیات، نام و نسب، ابتدائی تعلیم، بیعت اور ریاضت، تلقین وغیرہ عنوانوں کے تحت۔

۳۸۔ صباح الدین۔ عبد الرحمٰن۔ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود (معارف ۴۹ نومبر ۳۶۵-۳۷۸) حضرت چراغ دہلوی کے مضمون کی دوسری کڑی، اس قسط میں شاہی ملازموں کی اصلاح شاہی دربار سے تعلق۔ ذوق سماع وغیرہ عنوانات کے تحت معلومات درج کی ہیں۔

۳۹۔ عسکری۔ مرزا محمد ریاض خیرآبادی کی ایک ہلکی سی جھلک (آج کل ۴۹ نومبر دوم ۸-۹) مضمون نگار نے صاحب تذکرہ کو جوانی ادھیڑپن اور بڑھاپے میں قریب سے دیکھا ہے اور ان تین حالتوں کا ہلکا سا نقشہ اس مضمون میں کھینچا ہے، ریاض کی خمریات کی تعداد تیرہ سو سے زائد ہے شاعر نے شراب نوشی کا مضحکہ اڑایا ہے اور اس فعل کو برا سمجھ کر میخواروں کے ساتھ عجیب عجیب مذاق کیا ہے۔

۴۰۔ فرقت۔ غلام احمد۔ اورنگ زیب کی زندگی کے چند رنگین لمحات (آج کل ۴۹ اکتوبر حصہ دوم ۱۴-۱۶) اورنگ زیب کی شاہزادگی کے زمانہ کی ہیرا بائی عرف زین آبادی سے داستان معاشقہ۔

۴۱۔ گنجیں۔ کرنالی۔ وحید الدین سلیم (عالمگیر ۴۹ نومبر ۲۸-۳۳) صاحب وضع اصطلاحات وحید الدین سلیم پانی پتی کا شمار اردو کے مشہور مصنفین میں کیا جاتا ہے، بے شمار مقالات کے علاوہ انھوں نے چند عربی ناولوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ غوث علی شاہ کی مدح میں لکھا ہوا قصیدۂ غوثیہ آپ ہی کے افکار عالیہ کا نتیجہ ہے سلیم صاحب کی وفات ۱۹۲۸ء میں ہوئی۔

۴۲۔ قاضی۔ عبد الودود۔ غالب کا ایک فرضی استاد (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۶-۷) غالب کے اس دعوے پر کہ ایک نومسلم عبد الصمد ان کا استاد تھا، روشنی ڈالی گئی ہے اور مختلف دلائل کے ذریعہ اس دعوے کا بے بنیاد ہونا ثابت کیا ہے،

۴۳۔ قدوس۔ ایم۔ میرابائی (آج کل ۴۹ نومبر اول ۲۲-۲۴) جودھپور کے راجہ رتن سین کی تنہا بیٹی اور راؤ دے پور کے مہاراجہ کے لڑکے راجہ بھوج کی بیوی میرابائی ہندستان کی سولھویں صدی عیسوی کی مشہور شاعرہ ہے جس نے بھگتی شاعری میں کمال حاصل کیا۔

۴۴۔ قریشی۔ عبد الجبار۔ اتاترک (عالمگیر ۴۹ نومبر ۷-۱۰) اتاترک کے برسر اقتدار آنے کا پس منظر اور اتاترک کے ایڈریانوپل کے قبضہ تک کے حالات۔

۴۵۔ مالک رام۔ مرزا غالب (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۱-۱۶) مرزا غالب کے حالات اور عادات و خصائل کو بڑے دلکش اسلوب میں بیان کیا ہے۔

۴۶۔ معصومی۔ ابو محفوظ الکریم۔ امام ابراہیم نخعی (برہان ۴۹ اکتوبر ۶۸۱) چوتھی صدی ہجری کے مشہور تابعی حضرت امام نخعی کا تذکرہ۔ امام ابو حنیفہ کا مسلک جو حضرت عبد اللہ ابن مسعود اور

ان کے اصحاب کے فتاوی و روایات کا خلاصہ سمجھا جاتا ہے، دراصل امام نخعی کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ مضمون میں امام صاحب کی ولادت، اساتذہ و معاصرین وغیرہ کا بیان ہے۔

۴۷۔ معصومی۔ ابو محفوظ الکریم۔ امام ابراہیم نخعی (برہان ۴۹ دسمبر ۳۲۹-۳۴۲) سلسلہ کی دوسری کڑی اس قسط میں حسب ذیل عنوانات کے تحت معلومات فراہم کی ہیں، نخعی کی تفقہ، علم نخعی اور ترتیب فقہ، نخعی کے فقہ کا ماخذ، امام نخعی کے چند اقوال امام نخعی اور فرق مبتدعہ، ازدواجی زندگی۔ اخلاق و عادات وغیرہ، سال وفات ۹۵ھ۔

۴۸۔ حاجی مہدی، حاجی محمد۔ دوندے خاں نامہ (برہان ۴۹ نومبر ۳۰۵-۳۱۶) نواب دوندے خاں اپنی شجاعت اور بہادری کے لیے مشہور رہے، اسے بعض عقیدتمندوں نے "سلطنت مغلیہ کا آخری محافظ" بتایا ہے، مہدی صاحب کی فارسی مثنوی میں نواب دوندے خاں کے عدل و انصاف اور غربا پروری کا واقعہ نظم کیا ہے، دوندے خاں نامہ کو پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے ایڈٹ کیا ہے، اس مثنوی میں تقریباً دو سو اشعار ہیں۔

۴۹۔ مہر، غلام رسول۔ غالب کی خاندانی پنشن (دہلی گرلز میگزین ۴۹ غالب نمبر ۱-۲۸) مرزا غالب کے خاندان کے بعض افراد اور پنشن کے بعض واقعات کے متعلق فرحت اللہ بیگ مرحوم کے نتائج تحقیق سے بحث کی گئی ہے اور ان کو نادرست قرار دیا گیا ہے۔

۵۰۔ ندوی، نجیب اللہ۔ یحیی ابن آدم اور ان کی کتاب الخراج (معارف ۴۹ اکتوبر ۲۹۳-۳۰۰) امام ابو یوسف اپنی کتاب الخراج کے لیے مشہور ہیں، لیکن انھیں کے زمانہ میں اس فن پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ یحیی بن آدم کی سوانح حیات اور ان کی کتاب کا تعارف اس مضمون کا عنوان ہے۔ امام صاحب کی وفات ۲۰۳ھ میں ہوئی۔

۵۱۔ ندوی۔ نجیب اللہ۔ یحیی بن آدم اور ان کی کتاب الخراج (معارف ۴۹ نومبر ۳۶۷-۳۷۵) اس قسط میں کتاب الخراج پر مفصل تبصرہ ہے اور قاضی ابو یوسف کی مشہور کتاب سے مقابلہ کیا ہے اور دونوں میں جو فرق ہے اس کو بتایا ہے۔

۵۲۔ واصف۔ حفیظ الرحمٰن۔ ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل (برہان ۴۹ اکتوبر ۲۹۴-۳۰۰) اردو کے مشہور شاعر سائل کا تذکرہ کئی قسطوں میں چھپ رہا ہے یہ مضمون اس سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے، اس قسط میں سائل صاحب کی پبلک لائف پر بحث کی گئی ہے۔

۵۳۔ واصف دہلوی، حفیظ الرحمٰن۔ ابوالمعظم نواب سراج الدین احمد خاں سائل (برہان ۴۹ نومبر ۲۹۷-۳۰۴) مضمون کی چھٹی کڑی اس میں سائل کے ضبط و تحمل کے چند واقعات بیان کیے ہیں ۱۹۱۸ء میں مدرسہ امینیہ دہلی کے سالانہ جلسہ میں جو نظمیں سائل صاحب نے پڑھی تھیں، ان کو یہاں درج کیا ہے، سائل پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مشاعروں میں ترنم کی ابتدا کی۔

۵۴۔ واصف، حفیظ الرحمٰن۔ سراج الدین احمد خاں سائل۔ (برہان ۴۹ دسمبر ۳۷۱-۳۸۰) سلسلہ کی ساتویں کڑی اس قسط میں سائل کے مذہب اور سیاسی رجحانات پر بحث کی ہے۔ بالخصوص سائل کی وہ شاندار تضمین جو انھوں نے علامہ شبلی کی جنگ بلقان والی نظم پر لکھی تھی، اور جس کو سائل نے جامع مسجد دہلی کے ایک عظیم الشان جلسے میں سنائی تھی۔

لسانیات و ادب و تنقید ادب

۵۵۔ اداریہ۔ پشکن روسی عوام کا مایہ ناز ادیب (ہندستانی ادب ۴۹ اکتوبر ۲۸-۳۵) پشکن کے متعلق پروفیسر لاگوئی بے گولیس دو گو پولون کی رائے۔

۵۶۔ مالہ و ماعلیہ (نگار ۴۹ نومبر ۱-۳) صاحب اکبرآبادی کی ایک نظم پر تنقید جو کراچی کے ماہنامہ غزال کے اکتوبر کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔

۵۷۔ اعجاز، سید اعجاز حسین۔ نئے رجحانات (کاروان ۴۹ اکتوبر ۴-۸) جنگ عظیم کے بعد جنگ کا اور بعض دوسری تحریکوں کا ادب پر جو اثر پڑا اس کا تذکرہ، انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنا، اور اس کے بعض کارنامے اور ترقی پسند ادب کا تجزیہ۔

۵۸۔ اعظمی، خلیل الرحمٰن۔ مشہور شاعر، گمنام غزل گو (نگار ۴۹ اکتوبر ۱۷-۲۵) رزم ردولوی جن سے دنیا ایک مرثیہ نویس کی حیثیت سے خوب واقف ہے ان کا بحیثیت غزل گو مطالعہ اور ان کی غزلوں کی خوبیاں۔

۵۹۔ الیگزینڈر یے گولین، پشکن اور روسی ادب (کاروان ۴۹ اکتوبر ۴۳-۴۶) پشکن جدید روسی ادب کا خلاق مانا جاتا ہے اس مضمون میں اسی اثر کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔

۶۰۔ ایم۔ آذربائیجان کے ایک ڈرامائی تھیٹر کی ۷۵ ویں سالگرہ (ہندستانی ادب ۴۹ نومبر ۱۸-۲۰) آذربائیجان کا عزیز بیگ تھیٹر اس ملک میں بہت مشہور رہا ہے۔ اس تماشاگاہ نے فن اور ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور فن و ادب کو عوام سے قریب کر دیا ہے آذربائیجانی اور روسی ڈراموں کے علاوہ اس تماشاگاہ کے اسٹیج پر بیرونی ممالک کے کلاسکی ڈرامے بھی بتائے گئے ہیں۔

۶۱۔ انصاری۔ عبدالرحمٰن۔ اردو مرثیہ گوئی پر ایک نظر (شانہ ۴۹ ص ۳۳-۳۸) ابتدائی دور میں دکن مرثیہ گوئی کا گہوارہ رہا اور قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کی سرپرستی میں گولکنڈہ اور بیجاپور میں اس کا نونہال پودا پروان چڑھتا رہا۔ انیس نے اسی مرثیہ گوئی کو بام عروج پر پہنچا دیا۔

۶۲۔ باقر حسین۔ سید۔ ادب اور تاثیر (ماہ نو ۴۹ نومبر ۲۱-۲۵) ادب میں تاثیر کن چیزوں سے پیدا ہوتی ہے حسن موضوع، حسن تخیل

اور حسن ادا، ان تینوں میں حسن ادا سب سے زیادہ اہم ہے، یہاں تک کہ اگر باقی دو چیزیں نہ بھی ہوں تو بھی ادب یا شعر گوارا ہو سکتا ہے، اور بعض حالات میں خوش گوار اور پرتاثیر بھی۔

۶۳۔ بابری، سیتارام۔ پرندے اور انسان (آج کل ۱۵ نومبر اول ۳۱-۳۵) انسان نے نہ صرف پرندوں کی زندگی سے عبرت خیز باتیں چن چن کر اپنے آپ کو سدھارا ہے بلکہ ان کے استعاروں سے عالم بالا کے راز بیان کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ہماری ادبیات میں سے اگر پرندوں کے ناموں اور ان کے متعلق خیالات کو نکال دیا جائے تو وہ رنگینی اور دلچسپی قائم نہیں رہ سکتی جو آج ہم پاتے ہیں دنیا کی تمام مذہبی اور روحانی کتابوں میں پرندوں کے حوالے موجود ہیں۔

۶۴۔ بخاری بنگلوری۔ عزیز مہدی۔ ارمغان (معارف ۱۱ نومبر ۴۷ء ۳۸۶) محمد کمال ابن نور محمد مہدوی نواب حیدر علی خاں کے دور حکومت میں سری رنگ پٹن تشریف لائے ارمغان جو اشعار کی بیاض ہے اس کے یہی مولف ہیں اس بیاض میں بہت سے اولیا، صوفیا، اور متقدمین شعراء کا فارسی اور دکنی کلام جمع کیا ہے، اس بیاض کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دکنی شعرا مثلاً ولی، نصرتی، ہاشمی، مومن، یوسف سراج، سلطان وغیرہ کا بے شمار نایاب کلام موجود ہے، اسی نایاب مخطوطہ پر اس مضمون میں بحث کی ہے۔

۶۵۔ بدری پرشاد۔ ذوق کا تغزل (نگار ۱۱ اکتوبر ۴۹ء ۳۳-۳۹) ذوق کے کلام کی روانی چستی و بندش، اور اس کی نرم آہنگ پوپ اور رائیڈسن کے انداز کی معلوم ہوتی ہے، ذوق کی زبان میں نظیری سی سادگی کے باوجود تمام فن کارانہ صفات بھی موجود ہیں، ذوق کے اشعار کی عمومیت میں ادبی رنگ ہے،

۶۶۔ برکاتی، سید منظور الحسن۔ مومن اور ٹونک (آج کل ۱۵ نومبر دوم ۱۲-۱۵) برکاتی صاحب مشاہیر شعرا اور ٹونک کے زیر عنوان ایک تذکرہ تحریر کر رہے ہیں، یہ مضمون اسی کا ایک ٹکڑا ہے اس مضمون میں مومن کے ٹونک سے جو تعلقات تھے ان پر بحث ہے لیکن زیادہ جگہ پس منظر نے لی ہے جو بذات خود ایک مفید تمہید ہے۔

۶۷۔ بریلوی۔ عبادت اردو شاعری کے جدید رجحانات (شاہراہ ۳-۴ تمس ۵۶-۸۲) جب تک سماجی زندگی میں مادی ذہنی اور فکری زندگی میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس وقت تک ادب اور شعر کے نئے نئے راستے تعمیر ہوتے رہتے ہیں، چونکہ ۱۸۵۷ء میں ہماری سماجی زندگی بدل گئی اس لیے ادب، اور شاعری میں بھی نئے رجحانات پیدا ہو گئے، مثلاً عشق کے مختلف رجحانات سماجی اصلاح کے رجحانات وطن پرستی، اور انقلاب پسندی کے رجحانات وغیرہ، ان رجحانات کا تذکرہ جو اردو ادب اور شاعری میں ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہوئے

۶۸۔ بریلوی۔ عبادت اردو تنقید کے جدید رجحانات (اردو ۱۱ جولائی ۴۸ء ۷-۹) جب بدلتے ہوئے سماجی حالات اور افکار و خیالات نے اردو ادب میں نئے رجحانات کو پیدا کیا تو تنقید میں بھی اس کے اثرات نظر آئے، حالی، شبلی اور آزاد نے سب سے پہلے قدیم روایات تنقید کو خیرباد کہہ کر نئے خیالات و نظریات کو پیش کیا اور یہی نظریات کم و بیش ۱۹۳۶ء تک باقی رہے درمیان میں علامہ اقبال نے چند نئے خیالات پیش کیے، لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد سے ترقی پسند ادب وجود پانے لگا اور اس دور میں حقیقت نگاری کی وجہ سے تنقید میں نئے رجحانات کی نشو و نما ہونے لگی، مثلاً تاریخی تنقید، عمرانی تنقید، اور نفسیاتی تنقید وغیرہ۔

۶۹۔ بریلوی۔ عبادت۔ غالب کی عشقیہ شاعری (علی گڑھ میگزین ۴۹ء نمبر ۱۳-۲ ۳۵-۲) اردو ادب میں غالب کی عشقیہ شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس میں عشق کا انسانی تصور ملتا ہے، عشق کے سلسلہ میں پیش کیے ہوئے تمام خیالات، تمام واردات، اور تمام جذبات انسانی نفسیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور انھیں خصوصیات نے ان کی عشقیہ شاعری میں رس بھرا ہے۔

۷۰۔ بسم اللہ بیگم (نگار ۱۱ نومبر ۴۹ء ۳۷-۴۱) پنگھٹ کے گیت، برکھا کے گیت، اور ملاحوں وغیرہ کے گیتوں کا مختصر خاکہ کھینچ کر یہ بتایا ہے کہ اس عوامی صنف سخن میں کتنی زیادہ ہندستانیت ہے اور یہ گیت عوام کو کس قدر متاثر کرتے ہیں۔

۷۱۔ بسم اللہ بیگم نظیر اکبرآبادی (نگار ۱۱ دسمبر ۴۹ء ۳۰-۴۲) نظیر پہلے شخص تھے جنھوں نے محسوس کیا کہ مروجہ اردو شاعری میں نہ زبان عوام کی ہے نہ عوام کی زندگی سے اسے کوئی واسطہ ہے نہ اسلوب ایسا ہے کہ عوام اسے سمجھ سکیں۔ اس لیے نظیر نے نہ صرف شاعری میں اجتہاد کیا۔ بلکہ زبان و اسالیب بیان میں بھی، ان کے یہاں زبان اور کلچر کا امتزاج ہے۔ زندگی کی اقدار کا پتہ چلتا ہے۔ اور وہ عوام سے قریب ہو کر شعر کہتے تھے۔

۷۲۔ پالوی، عطاء اللہ، منور لکھنوی (آج کل ۱۵ نومبر دوم ۱۰-۲) منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی نظموں کے مجموعے "کائنات دل" کا تعارف اور چیدہ کلام کے چند نمونے،

۷۳۔ پطرس۔ احمد شاہ بخاری۔ آج کل کے اردو ادیب (ماہ نو ۴۹ء اکتوبر ۱۷-۱۹) موجودہ ادب پرانی روایتوں سے دن بہ دن دور سے دور تر ہوتا جا رہا ہے، اس دوری کی وجہ سے موجودہ ادیبوں کو جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کا تذکرہ۔

۷۴۔ جبال۔ جگل کشور۔ اردو کی ترقی میں ہندوؤں کا حصہ (میشیا ۴۹ء اکتوبر ۵۰-۵۳) سرشانتی سروپ بھٹناگر منشی بنواری لال شعلہ، اور شنکر دیال فرحت کا مختصر سا تعارف۔

۷۵۔ حمیدہ بیگم۔ ابلیس اقبال کی نظر میں (عثمانیہ ۱۱ مئی ۴۹ء ۲۸-۳۱) اقبال ابلیس کو حرکت انسانی کی ترقی کا ایک اہم جز قرار دیتے ہیں

ابلیس کی جرأت بے تحقیق کے سر تسلیم خم کرنے والے پست ذہنوں کے لیے نمونہ اور اس کی پیہم جد و جہد کو کمزور طبیعتوں کے لیے سبق سمجھتے ہیں۔ اقبال کا شیطان "فرمان بزدان و بندوں" کو اپنے دام فریب میں لانا سہل سمجھتا ہے۔

۷۶۔ حمیدہ سلطان۔ مسز سروجنی نائیڈو کی شاعری (رہنما ۱۴ نومبر۔ ۲۸۴-۲۸۸) گولڈن تھریشولڈ، شکستہ پر، اور ٹائم آف اسپرنگ کا مختصر تعارف اور بلبل ہند کی شاعری کی چند خوبیاں۔

۷۷۔ خورشید الاسلام۔ حالی (نگار ۴۹ نومبر ۹۔ ۱۶) حالی کے خطوط کی روشنی میں حالی کا نفسیاتی مطالعہ، یہ مکاتیب ان لمحوں کی یادگار ہیں جو شغل گریہ سے محروم رہ گئے، ان میں زندگی حسن اور توانائی کے آثار نا پید ہیں۔ لیکن اس نفسیاتی مطالعہ کے ذریعہ مضمون نگار نے حالی کی چند خوبیوں کو اجاگر کیا ہے، اور یہی خوبیاں حالی کو اپنے معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں۔

۷۸۔ ورد گورکھپوری۔ محمد رشید۔ ادب اور سماج (نگار ۴۹ دسمبر ۲۴-۳۳) اردو ادبا کے دو گروہ ہیں ایک ہیئت پرست اور دوسرا موضوع پرست، حالانکہ محض ہیئت اور محض موضوع ادب کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اب تک اردو ادب جو کئی دوروں سے گزر چکا ہے طبقاتی ادب تھا، یعنی اس ادب نے کبھی اس طبقہ کو اور کبھی اس طبقہ کو سراہا اور اس کے گن گائے لیکن ان کو جنتا سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اگر ہمیں ہندی اور اردو ادب کو ترقی دینا ہے تو ہمیں کسانوں کے ابھرتے ہوئے طبقہ سے ناتہ جوڑنا ہوگا، جاگیردارانہ دور کے اسلوب بیان مثلاً غزل وغیرہ کو ہم فی الحال استعمال کر سکتے ہیں، پھر موضوع خود ہیئت اور فارم کو بدل دے گا۔

۷۹۔ رضوی۔ اعجاز حید رجونپوری۔ کلام غالب میں فلسفیانہ عنصر (کاروان ۴۹ اکتوبر ۹-۱۱) غالب کے ان خیالات کا تجزیہ جن میں مابعد الطبیعات کے عناصر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور بعض مسائل کا فلسفۂ جدید سے مقابلہ۔

۸۰۔ رفیع الزماں۔ تیجر۔ غزلیہ شاعری اور غزل گو شعرا (ہمایوں ۴۹ دسمبر ۵-۲-۸۰۷) عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ غزل گو شعرا کی بے کسی اور ان کی مجبوری کی آئینہ دار ان کی غزلیں ہیں، حالانکہ غزلوں کا نفسیاتی مطالعہ بتاتا ہے کہ ان شعرا میں جفا طلبی کا رجحان بہت زیادہ نمایاں ہے جفا طلب شاعر مختلف گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں، تمام جفا طلب شاعر حقیقت میں جفا کوش ہیں اور ان کی جفا کوشی کا نشانہ ان کی اپنی ہی ذات ہے غزل گو شعرا کا نفسیاتی مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان شعرا کے رجحانات انسانی فطرت کے برعکس نہیں بلکہ اس کے عین مطابق ہیں۔

۸۱۔ زکی بریلی رامپوری۔ رامپور کی ادبی کروٹ (عالمگیر ۴۹ اکتوبر ۳۸-۴۲) رامپور کے موجودہ مصنفین کا نہایت مختصر تذکرہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ پرانی طرز کے مصنفین میں اتنی دل کشی نہیں جتنی نئی طرز کے لکھنے والوں میں ہے۔

۸۲۔ زیدی علی جواد۔ ترقی پسندوں کا بکھرتا ہوا شیرازہ (نگار ۴۹ نومبر ۲۷-۳۶) ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۹ء تک کے ترقی پسند ادبی رجحانات کا جائزہ لیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ اس دور کی ترقی پسندی کی تحریک کسی طرح کسی خاص سیاسی جماعت کی تحریک نہ تھی، اور اس میں حصہ لینے والے کسی ایک ہی جماعت کے ارکان نہ تھے ۱۹۴۲ء کے بعد کا ترقی پسند ایک بحرانی دور سے گزر رہا تھا اور آج تک اس کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی مضمون کا مقصد یہ ہے کہ آج کی ترقی پسند جماعت کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ہے، اور یہ ملک کے لیے تباہ کن ہے مصنف اصلی ترقی پسندوں کو انجمن مصنفین میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔

۸۳۔ سالک۔ عبد المجید۔ رسالۂ لطائف غیبی اور مرزا غالب (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۱۲۳-۱۳۰) قاطع برہان کی تائید میں جو رسالے لکھے گئے ان میں سے رسالۂ لطائف غیبی غالب کے ایک شاگرد میاں داد خاں سیاح کے نام سے شائع ہوا مضمون نگار نے مختلف دلائل کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس رسالے کے مصنف مرزا غالب ہیں نہ کہ سیاح۔

۸۴۔ شادانی وجاہت حسین عندلیب۔ اردو زبان کی ابتدا (اردو ۴۹ اکتوبر ۱۱۹-۱۲۴) مرزا جان طپش نے اپنا دیوان ۱۱۹۹ھ میں مرتب کیا اور گلزار مضامین اس کا تاریخی نام رکھا، دیوان کے شروع میں دیباچہ کے طور پر فارسی میں اردو زبان کی تاریخ پر ایک مفید مقالہ سپرد قلم کیا ہے، یہ مضمون اسی فارسی دیباچہ کا اردو ترجمہ ہے مضمون نگار کے خیال میں دیوان طپش کا دنیا میں صرف ایک نسخہ ہے اور وہ خود ان کی ملکیت ہے

۸۵۔ شیر زمانی۔ جوہر کی انشا پردازی (عالمگیر ۴۹ نومبر ۴۹-۵۱) ہندستان کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی جوہر ایک اچھے شاعر اور ایک اچھے انشا پرداز تھے، ان کا قلم میکالے کا قلم ان کی زبان برک کی زبان اور ان کا دل نپولین کا دل تھا۔

۸۶۔ سرور۔ آل احمد۔ اکبر کا المیہ (نگار ۴۹ دسمبر ۹-۲۳) اکبر مشرقیت کے عاشق تھے اور اسی لیے ان کے یہاں آئے دن کی تبدیلیوں اور انقلابات کا اتنا ماتم ملتا ہے کہ اردو کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں، اکبر کا عشق زندگی یا انسانیت سے نہیں بلکہ اس کے ایک خاص روپ سے تھا، آخری عمر میں جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان کا پسندیدہ روپ بدل کر ہی رہے گا تو وہ

مایوس ہو گئے اور گلستان دنیا سے نظر پھیر لیا، اور یہی ان کی ٹریجڈی ہے، نیز اس مضمون میں اکبر کی مذہبیت، تصوف، روحانیت اور نظام اخلاق پر بحث کی گئی ہے۔

۸۷۔ سرور۔ آل احمد۔ نظیر کی عوامی شاعری پر چند خیالات (شاہراہ ۳۔ ۴، ص ۸۳۔ ۹۰) عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ نظیر کے یہاں بازاری رنگ غالب ہے، لیکن یہی بازاری رنگ اور عوامی بولی ہے جس نے نظیر کو جنتا کا شاعر بنایا، نظیر نے جنتا کے جذبہ کی بڑی خوبی سے ترجمانی کی ہے، کیونکہ وہ ان کی بولی بولتے تھے، ان سے محبت کرتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش ہوتے تھے۔

۸۸۔ سہروردی۔ سعید۔ جگن ناتھ آزاد اور ان کی شاعری (نئی زندگی ۱۹۵۴ء نومبر ۵۔ ۵۵) جگن ناتھ آزاد، منشی تلوک چند محروم کے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں عیسیٰ خیل میانوالی میں پیدا ہوئے۔ شاعری میں انھوں نے اردو کے روایتی تغزل کی پیروی نہیں کی ______ اور دانستہ قدیم اساتذہ کی روش سے الگ رہے، آزاد ہر موضوع پر اپنے تاثرات کو خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، آزادی کی نظمیں جو تباہی اور بربادی کے متعلق ہیں اور جو ہندستان کو آزادی ملنے کے بعد کہی گئی تھیں وہ نہایت پر درد ہیں اور ان کو ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔

۸۹۔ سہروردی۔ شاہد۔ ادب کا منصب (ماہ نو ۱۹۵۴ء دسمبر ۱۷۔ ۸) مضمون ہذا پی۔ ای۔ این کی شاخ پاکستان کے انتخابی جلسہ کا خطبہ صدارت ہے۔ میری رائے میں پی۔ ای۔ این کا بنیادی تصور اور نظریہ یہی ہے کہ خالص ادبی مسائل پر توجہ مرکوز کی جائے، غیر متعلق سیاسی اور سماجی اوہام کی زنجیروں سے روح انسانی کو آزاد کیا جائے اور ادب کو پھر سے آزادی اور عزت کی فضا میں سانس لینے کا موقع دیا جائے۔

۹۰۔ سہیل بخاری۔ ترقی پسند ادب اور صحافت (نگار ۱۹۵۴ء اکتوبر ۹۔ ۱۲) موجودہ ترقی پسند ادب کے متعلق دو مکتب خیال ہیں (۱) ترقی پسند ادب، ادب نہیں صحافت ہے، (۲) یہ ادب ادب ہی ہے، مضمون نگار کا خیال ہے کہ موجودہ ترقی پسند ادب صحافت ہے، اور اسی نقطۂ نگاہ کو اس مضمون میں پیش کیا ہے۔

۹۱۔ شرما۔ رام بلاس۔ سوویت یونین میں زبانوں کا ارتقاء (شاہراہ ۳۔ ۴، ص ۹۰۔ ۱۲۹) اولاً زار شاہی روس کا پس منظر بتایا ہے، اور بعد میں سوویت حکومت نے روسی اور ملکی غیر روسی زبانوں کی ترقی میں جو حصہ لیا ہے اس کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے، سرمایہ دار ماہر لسانیات کے غلط نظریے، اشتراکی انقلاب کا روسی زبان پر اثر اور سوشلسٹ ملک میں زبانوں کی ترقی پر مفصل نوٹ لکھے ہیں، سوویٹ یونین میں زبانوں کے ماہر تمام ممالک میں بولی جانے والی زبانوں کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں ایک ضخیم کتاب لکھنے کی اسکیم بنائی ہے، جسے تیرہ حصوں میں شائع کیا جائے گا۔

۹۲۔ شیدا۔ راجندر ناتھ۔ پریم چند کے ناولوں میں اشاروں کی ترتیب (شاہراہ ۳۔ ۴، ص ۱۳۵۔ ۱۴۲) پریم چند نے اپنے گرد و پیش کا گہری نظر اور درستی سے مشاہدہ کیا، اور واقعات و نفسیات کو تجسس کرکے حقیقت حال کے سمجھنے اور سمجھانے کی پرخلوص کوشش کی۔ معیار پرستی کی بلندی پر سے نیچے اتر کر زندگی کو دیکھنا چاہا۔ پریم چند بہت سے مسائل پر گاندھی جی کی طرح غور کرتے تھے، اسی لیے ان کے ناولوں میں گاندھی جی کے فلسفے اور ٹکنیک کا اثر نمایاں نظر آتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ خاموش اور بے لوث خدمت، انتھک عمل اور انفرادی قربانیاں جادو کا اثر رکھتی ہیں۔

۹۳۔ صدیقی عبدالستار۔ دہلی سوسائٹی اور مرزا غالب (علی گڑھ میگزین، غالب نمبر ۴۹۔ ۱۹۴۸ء) دہلی سوسائٹی کا پہلا جلسہ جولائی ۱۸۶۵ء میں مسٹر ہلٹن کمشنر دہلی کی کوٹھی پر منعقد ہوا، سوسائٹی کے جلسوں میں مختلف مضمون پڑھے گئے، اگست کے جلسے میں جو مضمون مرزا غالب نے پڑھا وہ نقل کیا گیا ہے، اس میں کچھ حال شہر دہلی کی تباہی اور بارش کی کمی کا ہے۔

۹۴۔ صدیقی۔ نظیر۔ شاد عظیم آبادی کی غزلوں پر ایک نظر (نگار ۱۹۵۴ء دسمبر ۴۷۔ ۵۳) شاد ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۷ء میں وفات پائی، ان کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلے حصے کو تقلیدی یا روایتی دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور دوسرے حصے کو تخلیقی یا فکری دور کا نام دیا جا سکتا ہے، دور اول میں وہ لکھنؤ اسکول کے پیرو نظر آتے ہیں، اور دور ثانی میں نئے تصورات، نئے نظریات، نئے خیالات، نئی تعبیرات، اور نئے اسلوب بیان کے حامل ہیں۔

۹۵۔ عبدالحق۔ ڈاکٹر۔ اردو میں دخیل الفاظ (اردو ۱۹۴۹ء جولائی ۵۔ ۲۷) مستعار لفظوں کے لیے کلاسیکی عربی لفظ دخیل زیادہ موزوں ہے چونکہ اردو ایک مخلوط زبان ہے اس لیے اس میں دوسری زبانوں کا آجانا ناگزیر تھا، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، پرتگالی وغیرہ زبانوں کے الفاظ اردو میں داخل ہو کر موزوں ہو چکے ہیں، مضمون میں بہت سے دخیل الفاظ پر بحث کی ہے اور ان کا تاریخی پس منظر بتایا ہے۔ نیز ان دخیل الفاظ سے تمدنی اور تہذیبی تعلقات کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے، جو ہندستان کے دوسری اقوام کے ساتھ تھے۔

۹۶۔ عبدالحق۔ ڈاکٹر۔ دکنی اردو میں شاہنامے کی داستانیں (اردو ۱۹۴۹ء اکتوبر ۵۔ ۱۰) شاہنامہ کا اردو ترجمہ انیسویں صدی کے نصف آخر کا ہے، ابھی شاہنامے کا ایک اور ملخص ترجمہ دکنی اردو میں دستیاب ہوا ہے، یہ نظم اول الذکر سے پہلے لکھی گئی ہے، داستان زال کی پیدائش سے شروع ہوتی ہے اور رستم

کی سیادش سے انتقامی جنگ پر ختم ہوتی ہے جس مقامات پر شاعر نے فردوسی کے اشعار بجائے تجنیس کے پورا ترجمہ کر دیا ہے۔

۹۷۔ عبداللہ۔ ڈاکٹر سید۔ میر تقی میر کا رنگ طبیعت (اردو ۴۹ جولائی ۹۸-۱۰۳) ان حادثات و عوارض کا بیان جو میر کے رنگ اور افتاد طبیعت کے ذمہ دار ٹھہرے، مثلاً زمانے کے حالات نفسی اور موروثی اثرات، جسمانی ترکیب و ساخت، بچپن کا ماحول، تعلیم و تربیت وغیرہ وغیرہ۔ نیز اس رنگ کا اظہار میر کی شاعری میں کہاں تک ملتا ہے اس کا مفصل حال۔

۹۸۔ عبداللہ۔ ڈاکٹر سید۔ میر کا طرز (اردو ۴۹ اکتوبر ص ۸-۱۱) خلوص اور سچے جذبات، سوز اور راز، کلام کی سادگی اور بے تکلفی عام لہجہ، شیریں صوتیت، موسیقیت، اور معنوی تکمیل، ان سب عناصر کے اجتماع کا نام میر کا انداز ہے۔ مضمون اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

۹۹۔ عبدالعلیم۔ ترقی پسند ادیب آج کیا کریں (شاہراہ ۳۔ ۴۹ ص ۵۳-۴۸) زندگی کی کشمکش سے نہ خود ادیب الگ رہ سکتا ہے، نہ اپنی ادبی تخلیقات کو الگ تھلگ رکھ سکتا ہے، اسی غرض سے ترقی پسندوں کی انجمن وجود میں آئی، نئے دستور کے مطابق اس انجمن کے اغراض و مقاصد کیا ہیں جو کہ آٹھ دفعات بتائی گئی ہیں۔

۱۰۰۔ عرشی۔ امتیاز علی۔ غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ص ۱۰۷-۱۲۲) پچیس سال کی عمر تک مرزا اردو میں شعر کہتے رہے۔ بعد ازاں فارسی زبان سے فطری لگاؤ کی بنا پر فارسی میں کہنے لگے، ۱۸۵۰ء میں قلعہ سے تعلق پیدا ہوا، شاہ ظفر کی بدولت ان کی ریختہ گوئی نے دوبارہ جنم لیا، دیوان اردو پہلی مرتبہ سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خان بہادر کے مطبع سید المطابع میں ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔ مرزا کی کلیات نظم فارسی پہلی بار دہلی کے مطبع دار السلام سے ۱۸۴۵ء میں چھپ کر شائع ہوا تھا، دوسری بار مطبع نول کشور میں ۱۸۶۳ء میں چھپی۔

۱۰۱۔ فاروقی۔ اظہر علی۔ اردو شاعری میں ملکی اساطیری روایات (آجکل ۴۹ نومبر ص ۲-۵) اردو شاعری نے نقوش اور تاریخ کے زیر سایہ پرورش اور شاہی درباروں اور امرا کی محفلوں میں نشو و نما پائی اس لیے اس میں اساطیری روایات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، مصری یونانی، اسرائیلی، ایرانی اور اسلامی روایات کے علاوہ ہندو روایات کا بھی ایک اچھا خاصا ذخیرہ پایا جاتا ہے جسے اردو شاعروں نے اپنایا، اس مضمون میں ان مذہبی روایات کا ذکر ہے جن کا تعلق وید گ دہرم سے ہے، بعض محاورات اور تلمیحات کا بیان کیا ہے جو ان اساطیری قصوں کی روح ہیں۔

۱۰۲۔ فاروقی۔ محمد حسن۔ نثر نگاری کے اصول (ہندستانی ادب ۴۹ نومبر ص ۹-۱۷) ہندستان میں فنی اعتبار سے نثر نگاری نے اب تک کوئی قابل قدر کامیابی حاصل نہیں کی، عبارت کی ساخت اور اسلوب، پیراگراف، اور دیگر علامات کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی، نثر نگاری کو نظم نگاری سے آسان خیال کیا جاتا ہے حالانکہ اول الذکر دوسری صنف سخن سے بدرجہا مشکل ہے۔

۱۰۳۔ کرشن چندر۔ اردو کا جدید سرمایۂ ادب۔ افسانہ اور ناول (شاہراہ ۳۔ ۴۹ ص ۱۳-۴۲) اردو افسانے اور ناول کا جدید دور دراصل منشی پریم چند سے شروع ہوتا ہے، انھی نے ہماری افسانہ نگاری کے جسم سے پرانا جاگیرداری لباس اتار پھینکا یہ لباس بڑا مقفی اور مسجع تھا، منشی کی اخلاقی قدریں سماج کے نئے شعور سے متعلق ہیں، ان قدروں کو لے کر ترقی پسند ادب نے جنسی معاملات، بھوک، بیکاری، وغیرہ مضامین پر نہایت بیباکی سے آگے قدم بڑھایا، لیکن اس قسم کے ادب میں چند خامیاں رہ گئیں مثلاً جنسی لذت، ابہام، اور دماغی تھکن وغیرہ۔

۱۰۴۔ کلیم۔ محمد صدیق۔ ادب اور فرار (راہ نو ۴۹ دسمبر ص ۳-۵) رومان، فطرت، محبت، اخلاق، مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے مضامین کو آج فراری ادب کے نام سے پکارا جاتا ہے اور سماج، سیاست، اقتصادیات وغیرہ مضامین کو ترقی پسند ادب کا شاندار لقب دیا جاتا ہے، حالانکہ دونوں قسم کے مضامین کا زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق ہے۔ ادب میں موضوع کی ذات خود کوئی اہمیت نہیں ہوتی، ضرورت صرف صحیح اور ترقی پسند نقطۂ نظر کی ہے جو موضوع میں جان ڈال دیتا ہے، ادیبوں کو فراری موضوعات پر بھی دیانت داری سے غور کرنا چاہیئے اور ان کو زندگی میں صحیح مرتبہ دینا چاہیئے۔

۱۰۵۔ کیفی۔ برج موہن دتاتریہ۔ غالب کے پانچ شعر (آج کل ۴۹ نومبر حصہ اول ص ۳-۵) غالب کے پانچ شعروں کی مفصل تشریح

۱۰۶۔ مسکین۔ عبدالودود۔ غالب بحیثیت محقق (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ص ۱۷۱-۲۱۲) غالب کے محقق ہونے کے دعوے کو مفصل طریق پر دلائل کی قوت سے غلط اور بے بنیاد ثابت کیا گیا ہے، بارہ فصلوں میں غالب کی تحقیقات کو معرض بحث میں لاکر یہ بتایا ہے کہ غالب کا درجہ بحیثیت محقق کے کچھ زیادہ بلند نہیں۔

۱۰۷۔ قاضی۔ عبدالودود۔ آثار غالب (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ضمیمہ ص ۶۸) غالب کی اردو اور فارسی نثر و نظم کے بعض نمونے غیر حواشی کے ساتھ اکٹھا کیے گئے ہیں، اردو اور فارسی کے الگ الگ حصے ہیں۔

۱۰۸۔ مختار الدین احمد۔ نوادر غالب (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ص ۹-۱۰۴) اس مضمون میں غالب کی نثر و نظم کی بعض تحریریں جمع کی گئی ہیں۔ جو ان کے دیوان یا نثر کے مجموعوں میں شامل نہیں ہیں یہ تحریریں قدیم مطبوعہ کتب، شعرا کے تذکروں، اور قلمی بیاضوں کے بطن میں دفن تھیں۔

۱۰۹- انجنئی۔ بشیر۔ صورت سنگھ کی اردو شاعری (ماہِ نو ۴۹ نومبر ۴۹-۵۰) صورت سنگھ سندھ کا ایک ہندو شاعر تھا جس نے اردو اور فارسی میں نظمیں لکھی ہیں، اس کے دیوان کا نام پریم پرشاد ہے، جو مطبع دیا نند کراچی میں ۱۹۱۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا، اس دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مذہبی ہندو شاعر اپنی مذہبی روایات قلمبند کرتے ہوئے اردو زبان کو کس طرح آسانی سے استعمال کر سکتا ہے۔

۱۱۰- محمد بشیر احمد۔ کنڑی ادب پر ایک سرسری نظر (عثمانیہ ۴۹ ص ۱۴۹-۱۵۱) نویں صدی عیسوی میں کنڑی زبان کے چوٹی کے شعرا اور نثر نویس موجود تھے، کوی راج مارگ، راجہ نرپاتنگہ کی اسی زمانہ کی تصنیف ہے، جینیوں کے زمانے کے مشہور شعرا پیا (تقریباً ۹۴۱) پونا (تقریباً ۹۵۰) رنا (تقریباً ۹۹۳) ہیں، چاونڈ رائے کی پران کنڑی زبان کی سب سے پہلی نثر کی کتاب ہے بارھویں صدی سے لنگایت شاعروں کا دور شروع ہوتا ہے اور اسی دور کو کنڑی زبان کی آزادی کا دور کہا جاتا ہے، بعد برہمنوں کے دور کے چند مشہور ادیبوں کا ذکر ہے، زمانۂ حال میں کنڑی زبان نے کافی ترقی کی ہے اور اسی شاہراہ پر گامزن ہے۔

۱۱۱- محمد حسن۔ ادب، زندگی اور سماج (شاہراہ نمبر ۳-۴۹ ص ۴۳-۴۸) جب ہم ادب برائے زندگی کے مشہور فقرے کو استعمال کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں یہ بات واضح ہو جانی چاہیئے کہ ہم نہ صرف عوامی اور اجتماعی زندگی کی آئینہ داری کرتے ہیں بلکہ اس کی تعمیر اور رہبری کے لیے شعور اور عزم کی تشکیل بھی کرتے ہیں، جس لمحہ یہ طے ہو جاتا ہے کہ زندگی سے اجتماعی زندگی اور ادب سے عوامی ادب مراد ہے تو موضوع اور مواد ہیئت اور ٹکنیک کے تمام تر مسائل اسی معیار پر حل ہو جاتے ہیں۔

۱۱۲- محمد ظہیر الحق۔ خواتین کا افسانوی ادب (عثمانیہ ۴۹ ص ۵-۱۰۴) رشید جہاں، عصمت چغتائی، صدیقہ بیگم، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، محمودہ رضویہ، قرۃ العین حیدر، تسنیم، زینت ساجدہ وغیرہ آسمان ادب کے ستاروں کی بنیاد پیشیوں کا تذکرہ، مضمون میں ان خواتین کے افسانوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور ان کے حسن و قبح اسلوب بیان، انتخاب موضوع، اور پلاٹ وغیرہ پر بحث کی ہے عصمت کی فحش نگاری پر قدرے مفصل بحث ہے۔

۱۱۳- مفتون احمد۔ غالب کے خطوط (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۱۴۳-۱۴۹) اردو نثر کا مستقبل فورٹ ولیم سے نہیں بلکہ قلعہ معلی سے وابستہ تھا۔ فسانۂ عجائب سے بہتر موجودہ زمانے کے مختصر افسانوں کا رنگ اردو نثر میں جو ارتقا پایا جاتا ہے اس کی تشکیل میں خود ہندی اور اردوئے معلی کی ادبیت، رنگینی، اور ظرافت نے بڑا حصہ لیا ہے، مضمون میں خطوط غالب کا مطالعہ، طرز تحریر اور پس منظر کے نقطۂ نگاہ سے کیا گیا ہے۔

۱۱۴- ملیح آبادی۔ اظہار۔ نظیر کی شاعری میں ہندو کلچر (آج کل ۴۹ دسمبر ۴۹-۵۱) نظیر نے کنہیا جی کے جنم دن پر، کنس کے مغرور ہونے پر، دیوالی، دسہرہ، اور مہادیوجی کے بیاہ پر جو نظمیں لکھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمان اردو شعرا کس طرح ہندو کلچر سے متاثر تھے۔

۱۱۵- ہیمنت پرشاد۔ برہان قاطع اور قاطع برہان (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۱۳۵-۱۴۳) اس مضمون میں ان کتابوں اور رسالوں کا بیان ہے جو قاطع برہان کی حمایت یا مخالفت میں لکھے گئے۔

۱۱۶- نجم۔ نجم الحسن صدیقی۔ مختصر افسانہ (عالمگیر ۴۹ نومبر ۴۰-۴۱) اس مضمون میں ناول اور مختصر افسانے میں جو فرق ہے اس کو بیان کیا ہے، ایک فرق یہ ہے کہ ناول بیک وقت زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ مختصر افسانہ صرف ایک پہلو کی جھلک دکھلاتا ہے اور عموماً کسی ایک واقعہ پر مبنی ہوتا ہے،

۱۱۷- ندوی۔ عبد السلام۔ عربی نظم و نثر کی مختصر تاریخ (معارف ۴۹ دسمبر ۴۲۳-۴۵۰) اہل عرب کی زندگی پر شاعری کا اثر، زمانۂ جاہلیت کے انواع شاعری، اور جاہلی شعر کی لفظی اور معنوی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اصحاب معلقات کا تذکرہ اور ان کی نظموں کی تلخیص و خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۱۸- وحیدہ اعزاز۔ کلام اقبال کا ایک انگریزی مترجم (ہمایوں ۴۹ اکتوبر ۷۲۲-۷۲۵) مشہور مستشرق اے۔ جے۔ آربری کا تعارف اور ان کی تصانیف کا تذکرہ۔

۱۱۹- ہاشمی۔ آنسہ شہناز۔ کیا غالب کا کلام الہامی ہے (علی گڑھ میگزین ۴۹ غالب نمبر ۱۶۹-۱۷۰) جب تک کسی کے کلام میں عارفانہ پختگی، والہانہ شیفتگی، اور صوفیانہ صداقت نہ پائی جائے وہ صوفی شاعر نہیں ہے اور نہ اس کا کلام الہامی کلام ہے، غالب ایک مجازی اور دنیاوی شاعر ہیں، اور ان کا دیوان الہامی کتابوں کا ہم پلہ نہیں بلکہ دنیاوی رنگا رنگ بوٹوں اور نظر افروز پھولوں کا ایک رنگین چمنستان ہے جس میں کہیں کہیں عارفانہ اور فلسفیانہ رنگ کے پھول کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آرٹ (علوم و فنون)

(آثار قدیمہ، تعمیرات، علم کتبات، علم مسکوکات، فنون صنیفہ، مصوری، موسیقی)

۱۱۹- آفتاب احمد۔ فوٹوگرافی (ماہِ نو ۴۹ نومبر ۳۹-۴۰) اچھا فوٹوگرافر محض ایک فوٹوگرافر ہی نہیں بلکہ وہ اعلیٰ فن کار ہے۔ اس مضمون میں ان لوازمات کا تذکرہ ہے جن کو مدنظر رکھے بغیر کامیاب فوٹو نہیں اتر سکتا، نیز ان خصوصیات کا بیان ہے جو ایک فوٹوگرافر

میں ہونے ضروری ہیں۔

۱۲۰۔ دہلوی۔ شاہد احمد۔ ہماری موسیقی۔ ماضی اور مستقبل (ماہ نو ۱۹۴۹ دسمبر ۱۹-۲۰) ہندستان میں مسلمان بادشاہوں نے موسیقی کی ہمیشہ سرپرستی کی ہے، علاؤ الدین خلجی سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک سارے فرمانروا موسیقی کے دلدادہ گزرے ہیں، امیر خسرو اور بعض مسلمان گایکوں کا تذکرہ، ریڈیو پاکستان کو چاہیے کہ موسیقی ریسرچ اکاڈمی قائم کرے!

(الف) ۱۲۰۔ شفیع محمد۔ خان بہادر۔ آنند رام مخلص کی تحریر کا عکس (اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۹ نومبر ضمیمہ اول) آنند رام مخلص کی رباعیات مخلص کے قلمی نسخے سے مخلص کی تحریر کا عکس [illegible] نسخہ کا ایک اور عکس اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۱ نومبر میں شائع ہوا تھا۔

(ب) ۱۲۰۔ شفیع محمد خان بہادر۔ آرزو کی ایک تحریر کا عکس (اورینٹل کالج ۱۹۴۹ نومبر ضمیمہ دوم) سراج الدین علی خان آرزو کی تحریر کا ایک عکس جو ان کی چراغ ہدایت کے ایک نسخہ کے آخر میں متعلقہ کتاب کے تصدیق نامہ کے طور پر انھوں نے تحریر فرمایا ہے۔

۱۲۱۔ صدیق۔ حماد قیس۔ ہندستانی مصوری (آج کل ۱۹۴۹ دسمبر ۱۹۴۹۔ ۴۳-۴۴) مجموعی طور پر ابتدائی مراحل سے لے کر زمانہ موجودہ تک فن مصوری کی نہایت مختصر تاریخ اور ہر دور کی ظاہری و باطنی خصوصیات کا تذکرہ، ہند کی مصوری کی تاریخ میں گپت کا زمانہ سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے، اس زمانہ کی مصوری کے خاص خاص مرکز اجنتا، باغ اور بادامی ہیں ان سب تصویروں میں داستان سرائی ہے اور مذہبی قصوں کا تصاویر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے صرف ان لوگوں کے ہنرمند ہونے کا ہی ثبوت نہیں ملتا بلکہ یہ تصویریں ان کے رسم و رواج کا بھی آئینہ ہیں۔

۱۲۲۔ عزیز احمد۔ پروفیسر۔ اقبال کا نظریۂ فن (اردو ۱۹۴۹ اکتوبر ۱۱-۲۷) یہ سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس قسط میں اقبال کے نظریہ کو ذیل کے عنوانات کے تحت پیش کیا ہے۔ فن اور فطرت، کلاسیکی تصورات پر تنقید، فنون لطیفہ کی اسلامی قدریں، جمعیت، شاعری، فن تعمیر، موسیقی، مصوری اور تمثیلی فنون وغیرہ۔

۱۲۳۔ عزیز احمد۔ پروفیسر۔ اقبال کا نظریۂ فن (اردو ۱۹۴۸ جولائی ۳۸-۵۵) اقبال کے نظریۂ فن میں غیر معمولی تازگی اور اپج ہے ان کے تنقیدی نظریے بعض اوقات جدید تنقیدی مکاتب سے غیر معمولی مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کے تنقیدی نقطہ نظر میں شروع سے آخر تک صحت اور انفرادیت ہے، ان کا نظریۂ فن دراصل ان کے عام تفکرات اور تصورات کا محض ایک جزو ہے۔ مضمون میں اقبال کے نظریۂ فن کا حسب ذیل عنوانات کے تحت مطالعہ کیا ہے، فن کا محرک، حرکت، فن اور زندگی، فن برائے فن کی مخالفت، رجعت پسند فن، فنون لطیفہ اور حیات اجتماعی، نظریۂ فن اور خودی، فن اور آزادی وغیرہ دوران بحث میں اقبال کی بعض اصطلاحات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۱۲۴۔ کھنہ۔ رتن لال۔ مہاتما گاندھی اور آرٹ (آج کل ۱۹۴۹ اکتوبر حصہ اول ۱۳-۱۵) میں چاہتا ہوں کہ آرٹ کا روئے سخن عوام کی طرف ہو۔ عوام سے گاندھی جی کی مراد بالخصوص دیہاتی لوگوں سے تھی اور وہ چاہتے تھے کہ آرٹ ان گم نام لوگوں کی ترجمانی کرے گاندھی جی کی رائے میں سچا آرٹ آرٹسٹوں کی پاکیزگی، شانتی اور خوشی کا شاہد ہے، علاوہ ازیں گاندھی جی کے موسیقی پر جو خیالات ہیں ان کا بیان بھی کیا گیا ہے۔

۱۲۵۔ قریشی۔ عبد الجبار۔ عجائبات و روایات مصر (ماہ نو ۱۹۴۹ اکتوبر ۱۸-۲۱) مصر کے چند مشہور آثار قدیمہ کا مختصر بیان، مثلاً چوبیلو مینار، ممی، مخروطی مینار، مجسمہ ابوالہول، دریائے نیل اور ان کی طرف منسوب کی ہوئی چند داستانیں۔

۱۲۶۔ ندوی۔ عبد السلام۔ اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے (معارف ۱۹۴۹ نومبر ۳۴۴-۳۵۵) عہد مغلیہ کے گورنر اور دیگر امرا نے جو عمارتیں بنوائیں ان کا تذکرہ۔

۱۲۷۔ ندوی۔ عبد السلام۔ اسلامی ہند کے تمدنی کارنامے (معارف ۱۹۴۹ اکتوبر ۲۴۵-۲۶۲) یہ اس مضمون کی تیسری قسط ہے، اس میں بھی عمارتوں کا بیان ہے مثلاً مساجد، مدارس، [illegible] خانے وغیرہ، تالاب، حمام، اور باغات وغیرہ کا بیان ذرا تفصیل سے کیا گیا ہے۔

اقتصادیات

(عمومی اقتصادیات، مالیات، تجارت، زراعت، [illegible]، مزدوروں کے حالات، بیمہ داری، مواصلات)

۱۲۸۔ بیلیوری۔ محمد عبد الرزاق۔ کرنسی کی قیمتوں کی تخفیف (نئی زندگی ۱۹۴۹ نومبر ۲-۷) زرِ کرنسی [illegible] کی مارشل پلان اور پونڈ کے ڈی ویلیوشن کے متعلق [illegible] الوں کے یہ چند مفید باتیں درج مضمون ہیں۔

۱۲۹۔ زیدی۔ علی ناصر۔ دنیا کا سب سے بڑا جانور۔ وہیل (ماہ نو ۱۹۴۹ نومبر ۵۰-۵۲) مشہور مچھلی وہیل کے متعلق عام معلومات۔

۱۳۰۔ سبزواری۔ محمد احمد۔ پاکستانی زر کی نئی قدر (ماہ نو ۱۹۴۹ نومبر ۳۲-۳۴) پاکستانی زر کی نئی قدر کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ پاکستانی زر کی نئی قدر سے ملک کی خوش حالی میں اضافہ ہو جائے گا۔

۱۳۱۔ عبد الباقی۔ چور بازار (ماہ نو ۱۹۴۹ اکتوبر ۴۲-۴۳) حکومت پاکستان کا چور بازاری کے متعلق قانون، اور چور بازاری پر مختصر نوٹ۔

۱۳۲۔ عمر عامر۔ پاکستان کے جنگلات (ماہ نو ۱۹۴۹ نومبر ۴۹-۵۰) مشرقی اور مغربی پاکستان میں جنگلات کا تناسب تقریباً سولہ فی صدی ہے، پاکستان زراعتی ملک ہے اور زراعتی ملک کے

متوازن اقتصادیات کے لیے ۲۰ سے ۲۵ فی صدی جنگلات کا ہونا ضروری ہے پاکستان کو اپنے جنگلات کی نگہداشت اور توسیع کے لیے پر زور کوشش کرنی چاہیئے۔

۱۳۳۔ لیویلین۔ جے۔ ایل۔ پاکستان میں چائے کی صنعت (ماہ نو ۹۴ دسمبر ۹۰-۹۲) مشرقی پاکستان میں چائے کی صنعت کا درجہ ممتاز ہے، تقسیم ہند سے اس صنعت کو کافی نقصان ہوا، اور اب اس صنعت کی ترقی کے لیے حکومت پاکستان بہت سے اقدامات کر رہی ہے، گزشتہ سال چٹاگانگ میں پہلی مرتبہ چائے کا نیلام ہوا اور وہ کامیاب رہا، اس وقت پاکستانی چائے بیرونی ممالک میں برآمد کی جاتی ہے۔

۱۳۴۔ محمد عظمت اللہ۔ تجارت اور تشہیر (عثمانیہ ۹۴-۵۴) مغربی ممالک میں تشہیر سائنٹفک اصولوں پر کی جاتی ہے، اکثر یہ تشہیر کا کام ماہرین کے سپرد ہوتا ہے، جو بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اشتہارات تیار کرتے ہیں۔ یہ ماہرین سب سے زیادہ، لوگوں کی نفسیات کا خیال رکھتے ہیں، تشہیر کے مختلف طریقے مثلاً اخبارات و رسائل، بیرونی اشتہار بازی، فلم ریڈیو، نمائش اور فہرست، نمونہ بازی، اور نشان تجارت وغیرہ پر بحث کی ہے۔

۱۳۵۔ محفوظ علی خاں۔ سوویٹ روس کا نظام مواصلات (عثمانیہ ۹۴ ص ۶۹-۸۵) ملک روس کے مواصلات پر بحث، ریلیں، سڑکیں، داخلی و خارجی آبی رستے، ہوائی رستے، خارجی ہوا بازی، ڈاک، ٹیلی گراف، ٹیلی فون، ریڈیو وغیرہ کا موجودہ روس میں جس انداز سے انتظام کیا جاتا ہے اس کا بیان، اور ان تمام ذرائع کے متعلق اعداد و شمار۔

۱۳۶۔ نقوی حسین۔ پاکستانی کپاس کے دو سال (ماہ نو ۹۴ اکتوبر ۵۵-۵۷) ۴۸-۱۹۴۷ء اور ۴۹-۱۹۴۸ء میں پاکستانی کپاس کی سخت زری ممالک اور نرم زری ممالک میں برآمد کے اعداد و شمار۔

معاشرتی حالات

(عمومی معاشرتی حالات، تعلیم، آبادی، نفسیات علم ادویہ صحت عامہ، قانون)

۱۳۷۔ تابش۔ صدیقی لاہور کے میلے (ماہ نو ۹۴ اکتوبر ۳۱-۳۴) لاہور کے مشہور میلوں مثلاً میلہ چراغاں، مقبرہ کا میلہ، میلۂ بسنت، داتا گنج بخش کے عرس کا میلہ وغیرہ کا تاریخی اور روایاتی تذکرہ۔

۱۳۸۔ پودہ نوڈ سادی۔ محمد ظفر الدین۔ قدرتی نظام اجتماع (دیہات ۹۴ دسمبر ۳۴-۶۲) یہ سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے اس قسط میں ذخیرہ اندوزی حجامت کی کراہت، اسلامی مساوات

بغض و حسد کی روک تھام، جامع مسجد کا نظام، عیدگاہ کا نظام اور اسلامی عالمگیر کانفرنس وغیرہ ملت اسلامیہ کے اہم پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

۱۳۹۔ جیوتو پادھیائے شکلا دیوی۔ ادب اور فلم (آج کل ۹۴ اکتوبر حصہ اول ۳-۵) آج کل پردۂ فلم پر ڈاکوؤں کی ہیجانی کہانیوں اور گوالوں کی جرائم مندانہ کارناموں کو جس کثرت سے فلمایا جا رہا ہے وہ ارباب غرض کے کارنامے ہیں علاوہ پردۂ فلم کے ہندوستانی اسٹیج بھی اس وقت تک ناکارہ اور بے جان ہے، ہندوستانی ادب ابھی رسمیت اور قدامت پسندانہ فرسودگی کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا ضرورت اس بات کی ہے کہ نئے تقاضوں پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی جائے۔

۱۴۰۔ عثمانی۔ محمد احسن۔ محمد عربی کا معیشت اور سوشلزم (ہیثوا ۹۴ ربیع الاول ۳۰-۴۰) ان چھ اصولوں کا بیان جن کا سبق رسول مقبول صلعم نے معاشی مساوات پیدا کرنے کے لیے پڑھایا ہے، دائمی اسلام کا نظام معیشت صرف سوشلسٹ نظام سے ملتا جلتا ہے، مسلمان سوشلسٹوں سے اشتراک عمل کر کے اقتصادی اور سیاسی طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔

۱۴۱۔ قادری حمید الدین۔ علاء الدین خلجی کی معاشی حکمت عملی (عثمانیہ ۹۴ ص ۱۵۳-۱۷۰) علاء الدین خلجی پیدائشی سپاہی ہونے کے علاوہ نظم و نسق کا ماہر بھی تھا، اس نے تیرھویں صدی عیسوی کے آخر میں معاشی منصوبہ بندی کو وسیع پیمانہ پر روبہ عمل لانے کا کامیاب تجربہ کیا، اس مضمون میں قیمتوں کے تعین کے اسباب، نگرانی غلہ، کپڑے پر کنٹرول، مویشی پر کنٹرول عام اشیاء پر کنٹرول اور علاء الدین کی نگرانی نرخ کے کامیاب طریقوں پر اجمالی بحث کی ہے۔

۱۴۲۔ محمد حفیظ۔ مہاتما گاندھی کے تعلیمی نظریے (آج کل ۹۴ دسمبر ۲-۵) گاندھی جی کے خیالات مذکورۂ ذیل عنوانات پر، بچوں سے محبت، والدین کی ذمہ داری، گھر کے اثرات کی قیمت، تعلیم میں معاشرتی مقصد، ادبی تعلیم، اجنبی تہذیب، اخلاق اور دینی تعلیم، قومی وحدت، ضبط تہذیب قلب، نصاب کی کتابیں وغیرہ۔

۱۴۳۔ محمد ظفر الدین۔ قدرتی نظام اجتماع (دیہات ۹۴ نومبر ۲۷۰-۲۸۳) یہ اس مضمون کی تیسری کڑی ہے، اس قسط میں زیادہ تر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی فضیلتیں اور اس کے فوائد سے بحث کی گئی ہے۔

۱۴۴۔ محمود سید۔ ہندو مسلم کلچر کا ارتقاء مسلمانوں کی آمد سے آج تک (پیشوا ۹۴ اکتوبر ۳۸-۴۲) ہندو مسلمانوں

کے باہمی روابط پر ایک تاریخی نظر، بالخصوص عنوانات ذیل کے تحت، متحدہ قومیت۔ زبان، شعر و ادب، صوفیہ اور ہندو فقرا، تعمیرات، مصوری، سماج، لباس وغیرہ۔

۱۴۵۔ مخمور، لکھنوی۔ طب یونانی کی تدوین میں ہندوؤں کی شرکت (آج کل ۴۹ اکتوبر حصہ اول ۳۷۔۳۰) ہندی طبیبوں کا بغداد بلایا جانا، اور ان کی چند کتابوں کے تراجم، رازی نے جن ہندی کتابوں کا ذکر کیا ہے، ہندی دواؤں کا اپنایا جانا، ہارون الرشید اور منکہ کا قصہ، منکہ اور دیگر ہندی حکما کے تراجم، صالح بن بھلہ کی حذاقت کا قصہ، عربی طب کا خلاصہ ہندی طب میں۔

۱۴۶۔ مہر، غلام رسول۔ مرزا غالب کا مقدمہ (علی گڑھ میگزین (۱) غالب نمبر ۴۹۔ ۴۸) قاطع برہان کے جواب میں قاطع القاطع کے مصنف مولوی امین الدین دہلوی مدرس مدرسۂ پٹیالہ کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا جو مقدمہ غالب نے دائر کیا تھا اس کا مفصل بیان ہے۔

۱۴۷۔ ندوی۔ عبد السلام۔ زندہ معاشرت (مولوی ذوالحجہ ۱۷۔۱۸) صدر اسلام کے چند واقعات سے یہ بتایا ہے کہ اسلام میں بادشاہ عیش و عشرت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی خدمت کے لیے ہوتا ہے۔

سائنس

۱۴۸۔ سکسینہ، کنشور راج۔ انسان کا ارتقا (عثمانیہ ۴۹ ص ۱۰۷۔۱۱۶) حضرت انسان جن جن ارتقائی دوروں سے گزرتے ہوئے اپنے موجودہ درجہ پر پہنچے ہیں، ان کا مختصر تذکرہ ہر دور کی خصوصیات کے ساتھ، اور ان اعضا و خصائل کا تذکرہ جو انسان کو اپنے ارتقائی آباو اجداد سے ورثہ میں ملے ہیں۔

فلسفہ

۱۴۹۔ گوپال متل۔ شوپنہار (آج کل ۴۹ اکتوبر حصہ دوم ۷۲۔۳۶) یاسیت اور نامرادی کا سب سے بڑا مفکر شوپنہار کا تذکرہ، اس کے فلسفۂ قنوطیت کا تجزیہ، اور اس کی تصنیف "دنیا بہ طور عزم و خیال" کا تعارف۔

۱۵۰۔ مسعود حسین۔ ڈاکٹر۔ فلسفۂ اقبال پر تنقیدی اشارے (زمانہ ۴۹ اکتوبر ۲۰۔۲۱) اقبال کا فلسفۂ خودی جو ایک وجدانی طریق ہے، اس کا تجزیہ، اور ان کے فلسفۂ خودی کے نفسیاتی مفہوم کی توضیح۔

نفسیات

۱۵۱۔ اختر، شیر محمد۔ کردار کی تشکیل (نفسیات ۴۹ اکتوبر ۴۳۔ ۴۷) فرد کے کردار کی تشکیل کا انحصار بچپن کے ابتدائی پانچ سالوں پر ہوتا ہے، اس زمانہ میں اسے مختلف منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں، اور جب کبھی وہ ایک منزل پر آکر رک جاتا ہے تو پھر یہ رکاوٹ عمر بھر اس کی زندگی اور اعمال پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے انھیں دوروں کا تجزیہ اس مضمون کا مقصد ہے۔

۱۵۲۔ افتخار احمد۔ حافظہ کیا ہے (نفسیات ۴۹ دسمبر ۳۱۔ ۳۶) کسی چیز کو نفاست اور عمدگی سے ذہن نشین کرنے کے لیے علمائے نفسیات نے چھ طریقے ضروری قرار دیے ہیں، مثلاً تکرار، تشریح و تحلیل، شدت جواب، مشق وغیرہ، علمائے نفسیات کے نزدیک منقسم محنت بہت زیادہ بہتر ہے، مضمون میں تحفظ کے طریقوں سے بھی بحث کی ہے۔

۱۵۳۔ افتخار احمد۔ سیکھنا (نفسیات ۴۹ اکتوبر ۳۴۔ ۳۸) تعلیمی نفسیات پر ایک مقالہ، سیکھنے کی تعریف مقالہ نگار نے یوں کی ہے، سیکھنے میں فرد کی تجربات کو ترتیب و تنظیم کے ساتھ نئے راستوں سے گزار کر ایک مخصوص سمت کی طرف پھیر دیا جاتا ہے، اسی سیکھنے کے طریقوں پر بحث کی ہے، اور سیکھنے میں ترتیب، مقصد، کوشش، استقلال، اور اعادہ کتنے معاون ثابت ہوتے ہیں، نیز سیکھنے میں داخلی حالات، شی جو سکھائی جائے اور طریقۂ تعلیم کتنے موثر ہوتے ہیں، ان کا ذکر۔

۱۵۴۔ بٹ، اصغر۔ شادی کا نفسیاتی پس منظر (نفسیات ۴۹ اکتوبر ۴۸۔ ۵۰) زمانہ قدیم سے لے کر آج تک شادی کا نفسیاتی تجزیہ، اور اس کا تذکرہ کہ مختلف زمانوں میں عورت کس خاص زاویۂ نگاہ سے شادی کے متعلق سوچتی رہی ہے۔

۱۵۵۔ چاند، خورشید۔ ماں اور بچہ (نفسیات ۴۹ دسمبر ۲۲۔ ۲۵) بچپن میں ماں اور بچے کے تعلقات پر بچہ کی آئندہ زندگی کی کامیابی اور ناکامی منحصر ہے، اگر بچپن ہی سے ماں کا سلوک بچے کے ساتھ ایسا ہو کہ بچے میں جذباتی کشمکش پیدا ہونے نہ دی جائے اور اگر پیدا ہو بھی تو اسے آہستہ آہستہ سوچ کر سائنٹفک طریقوں سے دور کیا جائے تاکہ آئندہ زندگی میں، خواندہ نہ ہو سکے اس طرح بہت سی زندگیوں کو ناکام ہونے سے بچایا جا سکتا ہے۔

۱۵۶۔ داس۔ ونسنٹ اے۔ جسمانی بیماریوں کے نفسیاتی وجوہ (نفسیات ۴۹ اکتوبر ۱۵۔ ۱۶) جسم تمام جذبات انسانی مثلاً غم، محبت، نفرت، خوف، غصہ وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے، اور یہ جذبات آنکھ، کان، ناک، اور جلدی بیماریوں کا باعث بنتے ہیں، بعض لوگ ایسے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں جن میں وہ

دوسروں کو مبتلا دیکھتے ہیں۔

۱۵۷۔ جلیل احمد۔ خواجہ۔ اشاریت، جنسی توانائی اور نفسیات اجتماعی (نگار ۴۹ء دسمبر ۴۳۔۴۶) اشاریت SUGGESTION انسانی دماغ کے لیے ایک بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہے، اشاریت ان الفاظ اور اشارات کا نام ہے جو مناسب موقع اور خاص حالات کے تحت انسان کو حد درجہ متاثر کرتے ہیں، اور مخاطب کو بے بس کر کے اپنی بات منوا لیتے ہیں، اشاریت کے علاوہ مختلف قسم کے جتھوں کا نفسیاتی مطالعہ زیادہ تر فرائیڈ کے بتائے ہوئے اصول پر کیا گیا ہے، علاوہ ازیں یہ بتایا ہے کہ رجحانات گروپ میں داخل ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اندر ایک قسم کی ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

۱۵۸۔ جلیل احمد۔ خواجہ۔ صنعت و حرفت اور نفسیات (نگار ۴۹ء نومبر ۷ا۔۲۰) صنعتی نفسیات میں کام اور آرام کے باہمی تعلق کو کافی اہمیت دی جاتی ہے، یہ آرام جن طریقوں سے میسر آ سکتا ہے ان طریقوں کا بیان۔

۱۵۹۔ سہیل بخاری۔ خواب قدیم زمانے میں (آج کل ۴۹ء نومبر اول ۱۳۔۱۵) خواب کے متعلق مختلف قوموں اور علماء سلف کے اقوال نقل کیے ہیں، نیز تعبیر الرویا کا مختصر خاکہ کھینچا ہے۔

۱۶۰۔ صفدر النساء۔ بچوں میں جذبۂ قیادت (نفسیات ۴۹ء دسمبر ۲۱۷۔۲۲۲) چھ سات سال کی عمر کا زمانہ بچے کے کردار کا پختگی کا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں جو رجحانات اس کی ذات کا جزو بن چکے ہوتے ہیں، ان سے کبھی چھٹکارا پایا نہیں جا سکتا، اور اس کے کردار کی تشکیل ایک حد تک ان ہی اثرات کے زیر اثر ہوتی ہے، اس لیے بچے کو ایک متوازن اور خوشگوار فضا درکار ہے، جس میں نہ تو اس کے حقوق کو اتنی اہمیت دی جائے کہ خود سر، تنگ نظر، اور تنگ خیال ہو جانے کا احتمال ہو اور نہ اس کی اس طرح حق تلفی کی جائے کہ وہ خود اعتمادی کو بالکل کھو دے اور احساس کمتری و احساس ناکامی اس کی زندگی کو ہمیشہ کے لیے تلخ بنا دے۔

۱۶۱۔ عبید الرحمٰن۔ سماجی نفسیات (نفسیات ۴۹ء دسمبر ۲۲۸۔۲۳۳) نفسیات سماج پر ان تین شکلوں میں اثر انداز ہوتی ہے (۱) آدمی کا ایک دوسرے سے تعلق (۲) ایک شخص کا ایک گروپ سے تعلق (۳) ایک گروپ کا دوسرے گروپ سے تعلق، مختلف سماجی اداروں مثلاً اسکول، کالج، تھیٹر، کتب خانے اور کارخانہ کی ترقی کی رہنما بھی یہی سماجی نفسیات ہے، اور ہماری موجودہ سوسائٹی کی جتنی لعنتیں ہیں انھیں دور کرنے اور بہتر سماج بنانے کی بھی یہی نفسیات ذمہ دار ہے، خواہ وہ سماجی خامیوں کو دور کرے یا لاتعداد سماجی کارکن اور رہنما پیدا کرے جو موجودہ خامیوں کو دور کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔

۱۶۲۔ عذرا مریم۔ لسانی نشوونما (نفسیات ۴۹ء اکتوبر ۱۵۵۔۱۵۸) بچوں اور وحشیوں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ رواجی اور تقلیدی زبان سے پہلے اشارے یا قدرتی زبان رائج تھی۔ اس مضمون میں بچوں کی اس اشاراتی یا قدرتی زبان کے ارتقاء کا تجزیہ کیا ہے۔

۱۶۳۔ علوی عبد الحق۔ طبی نفسیات کی مختصر تاریخ (نفسیات ۴۹ء دسمبر ۲۲۳۔۲۲۷) ذہنی اور عصبی امراض کا باعث نفسیات ہے پرانے زمانے میں انھیں شیطانی روحوں کا اثر خیال کیا جاتا تھا۔ یہ نظریہ مختلف ادوار سے گزرتا ہوا مسمیریزم تک پہونچا، اور مسمیریزم سے اب تک جو انکشافات ہوئے ہیں ان کا مختصر خاکہ اس مضمون میں کھینچا گیا ہے۔

۱۶۴۔ عنایت بیگم۔ بچے کی جذباتی نشوونما (نفسیات ۴۹ء اکتوبر ۱۳۹۔۱۴۲) بچہ تین بنیادی جذبات ڈر، غصہ اور پیار لے کر پیدا ہوتا ہے، بچوں کے ان جذبات کو جانچنے کے تین طریقے اس مضمون میں بتائے گئے ہیں۔

تبصرہ

۱۶۵۔ تنہا۔ محمد یحییٰ۔ مرآۃ الشعراء (ع) (اردو ۴۹ء اکتوبر ۱۳۵۔۱۴۴) قابل مصنف نے شعرا کے کلام پر نہایت صفائی اور بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے، اور اکثر تذکرہ نویسوں کی رائے سے اختلاف کرنے میں مطلق تامل نہیں کیا، اس معاملہ میں انھوں نے تنقید کا حق ادا کیا ہے مبصر نے چند موٹی موٹی اور فاش غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔

۱۶۶۔ زبیری۔ محمد امین۔ ذکر شبلی (ش) (اردو ۴۹ء جولائی ۱۵۷۔۱۶۰) ہمیں یقین ہے کہ اسلامی ہند کے علماء ذکر شبلی سے حیات شبلی کی بہ نسبت زیادہ استفادہ کر سکیں گے۔

۱۶۷۔ قاضی۔ عبد الودود۔ تبصرۂ فرہنگ غالب (علی گڑھ میگزین ۴۹ء غالب نمبر ۲۵۳۔۲۷۳) فرہنگ غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی کی کئی مسامحات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ان نقائص کے باوجود جن کا ذکر اس تبصرہ میں کیا گیا ہے فرہنگ غالب ادبیات فارسی میں مفید اضافہ ہے۔

۱۶۸۔ گاوان۔ محمود۔ ریاض الانشاء (ق ۱۔۱۰) (اردو ۴۹ء جولائی ۱۴۳۔۱۵۰) ریاض الانشاء ان خطوط کا مجموعہ ہے جو گاوان نے بہمنی سلطان محمد شاہ کی طرف سے سلاطین مصر، روم و عراق اور ہندوستان، گجرات، مالوہ، جونپور وغیرہ کے فرمانرواؤں اور وزیروں کو لکھے تھے، مصنف کی زبان

بڑی سخت اور دشوار ہے، دور ازکار تشبیہات و استعارات اور لفظی الٹ پھیر کے سوا کوئی ادبی لطافت یا انشا پردازانہ رنگینی نہیں پائی جاتی۔ ریاض کو شیخ چاند صاحب نے ایڈٹ کیا ہے، مبصر نے مصحح کی بے شمار غلطیوں کی تصحیح کی ہے۔

۱۶۹۔ گلزار احمد۔ کام اور آرام (نفسیات ۴۹ء دسمبر ۲۳۶-۲۳۸) کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو آرام کی ضرورت ہے اگر ان کو آرام نہ دیا گیا تو مزدوروں کی صحت کے علاوہ کارخانہ کی اقتصادیات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے یہ آرام کب اور کتنا دیا جانا چاہیئے اور اس سے کیا فائدے حاصل ہوتے ہیں، مضمون میں اسی قسم کے مباحث کو پیش کیا گیا ہے۔

۱۷۰۔ اسج۔ ترجمان السنہ از بدر عالم (معارف ۴۹ء اکتوبر ۳۰۴-۳۰۹) ترجمان السنہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے احادیث کی نئی تبویب ہے۔

۱۷۱۔ اصلاحی۔ داؤد اکبر۔ مشکلات القرآن (معارف ۴۹ء نومبر ۳۶۹-۳۸۸) (ابو الجلال ندوی)

۱۷۲۔ ڈار محمد ابراہیم۔ ہندوستان میں مغلوں سے قبل فارسی ادب (اورینٹل کالج میگزین ۴۹ء نومبر ۳-۲۹) شمس العلماء پروفیسر عبد الغنی صاحب نے چند سال قبل "پرشین ان پری مغل انڈیا" نامی ایک کتاب لکھی اس کتاب پر مرحوم پروفیسر شیرانی صاحب نے ایک مفید اور سیر حاصل تبصرہ لکھا، اس تبصرہ کا جواب پروفیسر عبد الغنی صاحب نے جواب تبصرہ کے نام سے شائع کیا، پروفیسر ڈار نے تبصرہ اور جواب تبصرہ کے مابین ایک طویل محاکمہ سپرد قلم کیا ہے جو اورینٹل کالج میگزین میں بالاقساط شائع ہوتا رہا یہ مضمون اس سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے۔

۱۷۳۔ م۔ مرآۃ الشعراء از محمد یحییٰ تنہا (معارف ۴۹ء اکتوبر ۳۰۹-۳۱۶) اردو شعرا کا سب سے جامع تذکرہ۔

متفرقات

۱۷۴۔ اداریہ۔ شطرنج (نگار ۴۹ء دسمبر ۵۴-۵۶) شطرنج کے کھیل کا موجد کون تھا، خلفاء، وزراء اور علماء میں سے کون اس کھیل کا شائق تھا، اس کھیل کے انہماک کے متعلق چند عجیب واقعات۔

۱۷۵۔ حمید اللہ۔ ڈاکٹر۔ ابو حنیفہ دینوری کی کتاب النبات (معارف ۴۹ء دسمبر ۴۵۱-۴۶۲) دینوری کی کتاب النبات عرصہ دراز سے ناپید ہو چکی ہے اس کتاب کے تین باب مدینہ منورہ کے کسی کتب خانہ میں دو تین سال قبل دستیاب ہوئے تھے اس مضمون میں کتاب النبات پر مفصل اور فاضلانہ تبصرہ کیا ہے مضمون نگار کتاب کے تین دریافت شدہ بابوں کو ایڈٹ کر رہے ہیں۔

۱۷۶۔ کھنہ۔ رتن لال۔ صحافت نگاری میں انٹرویو کا آرٹ (آجکل ۴۹ء نومبر اول ۲۵-۲۷) صحافت نگاری میں انٹرویو سب سے نازک اور استادانہ آرٹ ہے، اس میں از حد چابک دستی شعور، سلیقہ اور مہارت درکار ہیں، نفسیات کا گہرا مطالعہ بہت زیادہ ضروری ہے۔ گفتگو کا آغاز، موضوع سخن کا انتخاب، اور گفتگو پیش کرنے کا انداز وغیرہ نہایت اہم چیزیں ہیں، صلاحیت سے لکھا ہوا انٹرویو ایک ناطق فلم کی طرح جگہ، وقت، شخصیت، ماحول، بات چیت وغیرہ کی ساحرانہ ڈرامائی طرز میں عکاسی کرتا ہے۔

۱۷۷۔ ندوی۔ سید ابو ظفر۔ ہندوستان میں توپ کی تاریخ (معارف ۴۹ء دسمبر ۴۰۵-۴۲۹) ضیاء برنی، محاصرہ رنتھمبور ۶۹۹ھ کے موقع پر پاشیب، گرگچ اور سنگ مغربی کا ذکر کرتا ہے، سنگ مغربی دراصل توپ ہے جو چھٹی صدی ہجری میں ایجاد ہو چکی تھی اور ساتویں صدی ہجری کے آخر میں اور آٹھویں صدی ہجری کی ابتدا میں اسپین، افریقہ، مصر اور عربوں میں رائج تھی، اس کے بعد مضمون میں ذیل کے عنوانات پائے جاتے ہیں، دکن میں بندوق، بیجانگر اور سلاطین بہمنی کے توپ خانے، توپوں کا قلعہ، کشمیر، گجرات اور مالوہ میں توپیں، محمود شاہی اور بہادر شاہی توپیں۔

وفیات

۱۷۸۔ حامد اللہ افسر۔ سروجنی نائیڈو (آجکل ۴۹ء اکتوبر اول ۲-۱۱) بلبل ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کی زندگی اور ان کی چند عمدہ نظموں کا اردو ترجمہ، اور دیگر کارنامے۔

۱۷۹۔ معصومی۔ ابو محفوظ الکریم۔ اصغر حسین (معارف ۴۹ء نومبر ۳۹۷) مولانا اصغر حسین صاحب سابق پرنسپل مدرسۂ شمس کا مختصر تذکرہ۔

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے قادری پریس بمبئی نمبر ۳ (نور منزل محمد علی روڈ) میں چھپوا کر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی سے شائع کیا

(۱) یہ خالص علمی و ادبی رسالہ ہوگا۔

(۲) اس میں اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۳) اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے ہیں انھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) اردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسرِ عام لایا جائے گا۔

(۵) رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

(۶) رسالہ ہر سال جنوری۔اپریل۔جولائی، اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔